حالی اور نیا تنقیدی شعور

پروفیسر اختر انصاری دہلوی

8
A
1
0

اردو اکیڈمی سندھ، کراچی

حالی
اور
نیا تنقیدی شعور

205

حالیؔ

اور

نیا تنقیدی شعور

اختر انصاری دہلوی
شعبۂ تعلیمات، مسلم یونیورسٹی - علی گڑھ

CHUGHTAI PUBLIC LIBRARY

اردو اکیڈمی سندھ کراچی

MASOOD FAISAL JHANDIR LIBRARY
Acc No. 7378
★ MAILSI ★

جملہ حقوق محفوظ

پہلی اشاعت

۱۹۶۲ء

کتابت : محمد رفیق خوشنویس

طباعت : انجمن پریس، کراچی

تعداد : ایک ہزار

قیمت

ایک روپیہ پچاس پیسے

TECHNICAL SUPPORT BY
CHUGHTAI
PUBLIC LIBRARY

دفتر پنجاب : اُردو مرکز۔ گنپت روڈ۔ لاہور

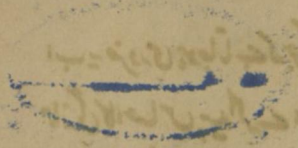

پیش لفظ

پچھلے چالیس سالوں میں حالی کے ادبی کارناموں پر مسلسل اور بہ کثرت لکھا گیا ہے۔ اُن کی شاعری، اُن کی تنقید، اُن کی سیرت نگاری، لفظ پرستی اور ہیئت پرستی کے خلاف اُن کا احتجاجی رویّہ، رواجیت اور لامقصدیت کے باب میں اُن کا مخالفانہ اقدام، اور مجموعی حیثیت سے اُن کی باغیانہ تحریک کے اثرات اور نتائج ——— اِن میں سے ہر چیز بارہا گفتگو یا بحث و تمحیص کا موضوع بن چکی ہے۔ ایسی حالت میں حالی کی تنقید پر کوئی مقالہ لکھنا اور اُسے کتابی شکل میں پیش کرنا دراصل بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔

اب یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ جو کچھ لکھا جائے وہ خیال انگیز ہو، تازگی کا احساس پیدا کرے، موضوعِ زیرِ بحث پر جو روشنی اب تک پڑ چکی ہے اُس میں اضافہ کرے، اور متعلقہ مسائل کے سلسلے میں تنقیدی گرفت کو زیادہ مضبوط اور فنی بازیافت کو زیادہ حقیقی بنائے۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ زیرِ نظر مقالہ اِن شرائط کو بہ درجۂ اتم پورا کرتا ہے۔ ہاں یہ ضرور محسوس کرتا ہوں کہ حالی کے تنقیدی شعور کا تجزیہ جس خاص زاویے سے میں نے کیا ہے شاید اس سے پہلے نہیں کیا گیا۔ میں نے اُگلے ہوئے نوالے نہیں چبائے۔ اپنے آزادانہ مطالعے کی روشنی میں آزادانہ طور پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ میرے نزدیک یہی اِس مقالے کی موجودہ اشاعت کا جواز ہے۔ پھر بھی ممکن ہے کہ میں نے یہ رائے قائم کرنے میں غلطی کی ہو۔ اپنے بارے میں فیاضانہ روش اختیار کرنا، یا اپنے کام کے سلسلے میں فراخ دلی کے ساتھ سوچنا ایک عام انسانی کمزوری ہے۔ بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اپنے حق میں ڈنڈی مارنے کے جرم سے بچ نکلتے ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ اس مقالے کے متعلق رائے قائم کرنے میں

میں بھی اس جرم کا شکار ہوا ہوں۔ اگر واقعی یہ صورت ہے تو اس کوشش کو بلا تامل رد کر دیا جائے۔

مقالے کے سلسلے میں ایک دل چسپ بات کا تذکرہ شاید یہاں بے محل نہ ہو۔ گو مجھے افسوس ہے کہ اس دل چسپ بات کا ذکر کرنے کی یہاں ضرورت پیش آئی۔ اس مقالے کی بنیاد دراصل وہ "اشارات" ہیں جو کئی سال پہلے میں نے شعبۂ اردو میں ایم۔ اے کے طلبہ کو حالی کے مطالعے کے سلسلے میں لکھوائے تھے۔ میں نے اُسی وقت ارادہ کر لیا تھا کہ کسی قریبی فرصت میں ان اشارات کی مدد سے حالی کی تنقید پر ایک تفصیلی مضمون لکھوں گا۔ کچھ دنوں کے بعد ایک موقر ادبی جریدے کی ورق گردانی کے دوران میں مجھے یہ اشارات ایک تنقیدی مضمون کی شکل میں کسی خاتون کے نام سے چھپے ہوئے نظر آئے۔ جن طلبہ کو میں نے یہ اشارات لکھوائے تھے اُن کے ساتھ بے انصافی ہوگی اگر میں یہ نہ بتاتا چلوں کہ یہ حرکت اُن میں سے کسی کی نہیں تھی۔ میں اُس مضمون کو دیکھ کر خاموش ہو گیا، اور جہاں تک مجھے یاد ہے، میں نے رسالے کے ایڈیٹر کو بھی متوجہ

کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ اب اِدھر حال میں وہی مضمون اُسی نام کے ساتھ مَیں نے ایک کتاب میں دیکھا جو مختلف لکھنے والوں کے متفرق تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے اور شاید طلبہ کی ضروریات کو مدِ نظر رکھ کر شائع کی گئی ہے۔ اِس دوران میں مَیں اپنا مقالہ مکمل کر چکا تھا۔ لیکن اِس دفعہ پھر مَیں نے کتاب کے مرتّب یا ناشر سے کوئی تعرض کرنا غیر ضروری خیال کیا۔ البتہ اِس وقت یہ پیش لفظ قلمبند کرتے ہوئے ضروری معلوم ہوا کہ اِس بات کو پڑھنے والوں کے علم میں لے آیا جائے، مبادا کل کلاں کو کوئی "ادبی سراغ رساں" اِس کا پتا چلائے تو مَیں ایک خاتون کے مضمون سے نہ صرف چلّے کے چلّے بلکہ پیراگراف کے پیراگراف چُرا لینے کے جرم میں بے وجہ پکڑا جاؤں اور گردن زدنی قرار پاؤں (میرے اِس بیان سے نہ صرف خاتونِ مذکور ایک مضمون کی ملکیت سے محروم ہوئیں بلکہ مستقبل کے ادبی سراغ رساں بھی سراغرسانی کے ایک زبردست کارنامے کی مسرت سے محروم ہو گئے!)

ایک زمانہ تھا کہ ادبی تصانیف خصوصاً مجموعہ ہائے اشعار احباب کے پیہم اصرار سے مجبور ہو کر شائع کئے جاتے

تھے۔ اب ایسا کم ہوتا ہے۔ لیکن میں اپنا یہ مقالہ اگر احباب کے اصرار سے مجبور ہو کر نہیں تو اُن کے مشورے سے متاثر ہو کر ضرور شائع کر رہا ہوں۔ دراصل یہ میرے تنقیدی مضامین کے مجموعے (مطالعہ و تنقید) میں شامل تھا جو اِس وقت زیرِ طبع ہے۔ مگر بعض دوستوں نے رائے دی کہ اِس کو علٰحدہ کتابی شکل میں شائع کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔ مجھے یہ رائے صائب معلوم ہوئی اور مقالہ کتابی شکل میں حاضر ہے۔

اختر انصاری دہلوی
شعبۂ تعلیمات
مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

یکم فروری ۱۹۶۱ء

حالی اور نیا تنقیدی شعور

اُردو میں تنقید کی ابتدا حالی نے کی۔ "مقدمہ شعر و شاعری" ہمارے ادب میں پہلی تنقیدی تصنیف ہے۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا حالی سے پہلے اردو ادب تنقید سے بیگانہ محض تھا، یا یہ کہ تنقید ہمارے یہاں کسی نہ کسی شکل میں موجود تھی۔ کیا ہمارے قدیم ادب میں کوئی ایسی روایت بھی ملتی ہے جسے ہم تنقید یا تنقیدی شعور کی روایت کہہ سکیں؟

اگر غور کیا جائے تو ایک طور سے تنقید کا وجود اُتنا ہی قدیم ہے جتنا خود شعر و ادب یا فن کا وجود۔ شاعر یا فن کار محض اِس بنا پر کہ وہ شاعر یا فن کار ہے، ناقدِ شعر یا ناقدِ فن بھی ہوتا ہے۔ وہ اپنے ذہن میں حسن و قبح اور خوب و زشت کا

کوئی نہ کوئی معیار ضرور رکھتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو یعنی بلند و پست کا کوئی مفہوم اُس کے ذہن میں نہ ہو، تو خوب سے خوب تر کی جستجو بھی اُس کے لئے ممکن نہ ہو، اور جس پیہم تدریجی ارتقا کے آثار اُس کے تخلیقی عمل میں نظر آتے ہیں وہ یکسر مفقود ہو جائے۔ پھر اِس صورت میں اعلیٰ اور بلند پایہ فنی کارناموں کی تخلیق کا سلسلہ بھی جاری نہیں رہ سکتا۔ ایک شاعر کو شعر کہنے کے دوران میں کتنی ہی منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ پہلے وہ اپنے ذہن میں فکری مواد فراہم کرتا ہے۔ پھر فراہم شدہ مواد میں اضافہ و ترمیم کا عمل شروع ہوتا ہے۔ قطع و برید، چھان پھٹک اور ترتیب و تشکیل کا یہ اندرونی عمل بسا اوقات کافی طویل ہوتا ہے۔ اِس کے ساتھ ساتھ یا اِس کے فوراً بعد اسلوب یا پیرایۂ اظہار کی تعیین کا عمل بھی شروع ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ شاعر کا تنقیدی شعور ہی اُس کو اِن تمام منزلوں سے کامیابی کے ساتھ گزرنے میں مدد دے سکتا ہے اور دیتا ہے پست سے بلند اور بلند سے بلند تر کی طرف شاعر کے ذہن کی حرکت کسی نہ کسی تنقیدی شعور کے بغیر ممکن نہیں۔ اب اگر یہ تصور صحیح ہے اور اُس عام تنقیدی روایت کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں

جو تخلیقی فن کے متوازی اور پہلو بہ پہلو چلتی ہے اور برابر اپنا کام کرتی ہے تو پھر ہم قدیم اردو ادب کو بھی تنقید سے بیگانہ محض قرار دینے میں حق بجانب نہیں ہو سکتے۔

علاوہ اس بنیادی اور فطری احساسِ نقد کے جو ہر فن کار کے ذہنی سرمایے کا ایک لازمی اور غیر منفک جزو ہوتا ہے، ہمارے یہاں تنقیدی شعور کا اظہار مشاعروں کی محفلوں اور تذکروں کے اوراق میں بھی ہوا ہے۔

مشاعرہ قدیم زمانے میں سب سے زیادہ مقبول اور ہمہ گیر علمی و ادبی ادارہ تھا۔ یہ وہ نقطہ تھا جس پر تمام ادبی دل چسپیاں مرکوز ہو جاتی تھیں، وہ محور تھا جس کے گرد ہر قسم کی شاعرانہ دل بستگیاں مجتمع و رقصاں نظر آتی تھیں۔ مشاعرے میں خالص علمی لوگ بھی ہوتے تھے اور شعر کہنے اور شعر سننے والے بھی۔ پھر ان میں دماغ کی ہر سطح اور ذوق کی ہر نوعیت کے لوگ ہوتے تھے کہنہ مشق اور بالغ نظر اساتذہ کے دوش بدوش مبتدی شعرا بھی نظر آتے تھے اور شعر فہمی کا رچا ہوا ذوق رکھنے والوں کے پہلو بہ پہلو محض داد و واہ سے لطف اندوز ہونے والے یا شعر کی ترکیب سے ایک

مبہم ذہنی لذت حاصل کرنے والے بھی دکھائی دیتے تھے۔
ہر رنگ اور ہر معیار کا کلام پیش کیا جاتا تھا جس میں ہر شخص کے ذوق کی تسکین اور ہر ذہن کی آسودگی کا سامان ہوتا تھا۔
اساتذۂ سخن اپنے کمال کا مظاہرہ کرتے تھے اور سخن فہم اچھے اشعار کی داد دے کر اور ضمناً محاسنِ اشعار کی طرف اشارہ کر کے اپنی سخن فہمی کا ثبوت بہم پہنچاتے تھے۔ اِس سخن سنجی اور سخن شناسی سے نو مشق شعرا اچھا شعر کہنے کے گُر سیکھتے تھے اور عام حاضرین اپنے ادبی ذوق کی تربیت کرتے تھے۔ اچھے اور کامیاب شعر کے لوازم و خصوصیات بہر حال اُجاگر ہوتے اور روشنی میں آتے تھے، اور مضمون و خیال، زبان و بیان اور وزن و بحر کی اونچ نیچ ظاہر ہوتی تھی۔

اِس کے معنی یہ ہیں کہ کچھ مسلّمات، کچھ مزعومات، نقد و نظر کے کچھ اصول، خوب و ناخوب کے کچھ معیار ضرور ایسے تھے جو شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر لوگوں کے ذہنوں میں موجود تھے۔ اِن اصول و مسلّمات کے بغیر اشعار پر کسی قسم کی رائے زنی تحسین یا تنقیص کی شکل میں، ممکن نہ تھی۔ اِن کا سرچشمہ اساتذۂ وقت کا کلام اور علمائے ادب کی

ذات تھی اُدبی سرچشمے ہے نومشق شعرا یا شعر و شاعری کا ذوق رکھنے والے نوجوان نقد و نظر کے اصولوں کا اکتساب کرتے تھے۔ مختصر یہ کہ پرانے زمانے میں مشاعرے ایسی ادبی محفلیں تھیں جن میں تنقید کے اصول غیر شعوری طور پر ذہنوں میں مرتب و مدون ہوتے تھے اور اشاعت و ترویج حاصل کرتے تھے۔

قدیم زمانے کا تنقیدی شعور مشاعروں کے علاوہ، تذکروں کے اوراق میں بھی ظہور پذیر ہوتا تھا۔ یعنی جس طرح مشاعروں میں شعرا کے کلام پر واد اور واہ واہ کی شکل میں پسندیدگی کا اظہار اور بعض اوقات اعتراضات کی شکل میں ناپسندیدگی کا اظہار کیا جاتا تھا، اُسی طرح تذکروں میں ایک طرف تحسین و تکریم اور دوسری طرف تنقیص و تعریض کی شکل میں رائے زنی کی جاتی تھی۔ اُس زمانے میں تذکرہ نویسی کا رواج عام تھا۔ بالعموم وقت کے مقتدر شعرا تذکرے تصنیف کرتے تھے۔ تنقید سے براہِ راست اِن کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ دراصل ادبی یادداشتیں یا نہایت غیر رسمی انداز کی ادبی تاریخیں ہوتی تھیں۔ یوں تو ان میں مختلف شعرا کے حالات، ان کے کلام کا انتخاب، ان کی شاعری پر اظہارِ خیال، بھی

کچھ ملتا ہے، مگر ہر چیز سرسری، غیر رسمی اور بے قاعدہ طور پر ہے کہیں کسی اصول کی پابندی نہیں۔ نہ کسی تنظیم اور باقاعدگی کا التزام ہے۔ شعرا کے حالات اِس طور سے قلمبند کئے جاتے ہیں کہ اُن کی تعلیم و تربیت، اُن کے سماجی ماحول، اُن کے ادبی مشاغل اور اُن کے ذہنی ارتقا پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ نہ اُن کی شخصیتیں نمایاں ہوتی ہیں۔ شخصی اوصاف اور کرداری خصوصیات پر اول تو تذکرہ نگار کی نظر ہی نہیں پڑتی۔ اور اگر پڑتی بھی ہے تو ان چیزوں کو اس طرح اُبھار کر بالوضاحت پیش نہیں کیا جاتا کہ زندہ اور جیتی جاگتی ہستیاں وجود میں آئیں۔ ہر شاعر کے ضمن میں ایسا عمومی انداز اور ایسے حاوی الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں کہ کوئی منفرد شخصیت اُبھر کر نظروں کے سامنے نہیں آتی۔ کہیں کہیں کوئی تفصیلی مرقع بھی ملتا ہے، لیکن ایسے مقامات پر بھی خالی خولی مدح سرائی یا بے محابا عبارت آرائی کی وجہ سے کسی واضح تصویر کے نقوش اُجاگر نہیں ہوتے۔ شعرا کے سوانح حیات کے باب میں اس دور کے تمدن و معاشرت، سیاست و اقتصاد اور اقدار و تصورات کو جھلکانے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ اور

اور اس کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کسی شاعر کے کلام کو اُس کے تمدنی پس منظر کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے۔ کہیں کہیں محض ضمناً اور اتفاقاً سماجی ماحول کے بعض نقوش بے شک اجاگر ہو جاتے ہیں شعرا کے کلام کا انتخاب بھی کسی اصول یا غایتی میلان کے تحت نہیں ہوتا۔ عام طور پر ایسے اشعار پیش کئے جاتے ہیں جو زیرِ بحث شاعر کے عام اسلوب و رنگ کی نمائندگی نہیں کرتے۔ اور بسا اوقات تو بہترین اور بدترین اشعار نہایت پھوڑپن کے ساتھ ایک جگہ جمع کر دئے جاتے ہیں۔ باقی رہی کلام پر تنقید، تو وہ کہیں تو محض برائے نام ہوتی ہے اور کہیں محض برائے نام بھی نہیں ہوتی۔ تنقیدی اصولوں اور کلیّوں سے تو تذکرہ نگار بحث ہی نہیں کرتے۔ صرف شعرا کے کلام پر جہاں تہاں سرسری انداز میں اظہارِ رائے کرتے ہیں یا اظہارِ رائے اکثر و بیشتر محاسن و معائب کو رسمی طور پر روایتی الفاظ میں گنوا دینے سے آگے نہیں بڑھتا۔ اس کا تعلق ہمیشہ زبان و الفاظ، محاورہ و روزمرہ، بندش و ترکیب اور قافیہ و وزن، یعنی شعر کے خارجی پہلوؤں سے ہوتا ہے۔ تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ تذکرے اپنے تنقیدی افلاس

اور شعور کی تہی مایگی کے باوجود بعض تنقیدی مفروضات کی آئینہ داری کرتے ہیں، اور یقیناً تذکرہ نویسوں کے ذہن میں بھی ادب و فن کے کچھ معیار تھے جن کی رہبری میں وہ شعرا کے کلام پر رائے زنی کرتے تھے۔

○

ابھی اس امر کی وضاحت کی گئی کہ حالی سے پہلے اردو میں باقاعدہ تنقید کا وجود نہیں تھا۔ گو تبصرہ و نقد کی ایک سرسری اور غیر منظم سی روایت ضرور موجود تھی، اور شاعرانہ حسن و قبح اور فنی بلندی و پستی کے کچھ معیار یقیناً تھے جو اُس وقت تک کسی منظم اور باقاعدہ شکل میں قلمبند نہیں کئے گئے تھے، مگر ذہنوں میں ضرور مرتب و مدون ہو چکے تھے یا ہو رہے تھے۔ حالی نے سب سے پہلے ان اصولوں اور معیاروں کو ضبطِ تحریر میں لانے کی کوشش کی۔ انھوں نے شعر، ادب اور آرٹ کی ماہیت پر نظر ڈالی اور نقد و نظر کے بنیادی اصول متعین کئے۔ اسی لئے حالی اردو کے پہلے باقاعدہ نقاد قرار پاتے ہیں، اور "مقدمہ شعر و شاعری" اردو میں تنقید کی پہلی کتاب ہے۔ شعر الہند کے مصنف نے لکھا ہے:

"دورِ جدید میں جب الفاظ و محاورات کو چھوڑ کر ہمارے شعرا کی توجہ تمام تر معانی و مطالب کی طرف مبذول ہو گئی اور اردو شاعری پر معنوی حیثیت سے اعتراضات کیے جانے لگے تو جدید شاعری کے ساتھ فنِ تنقید کا بھی ایک نیا دور شروع ہوا اور سب سے پہلے مولانا حالی نے اپنے دیوان کے مقدمے میں اردو کے تمام متداول اصناف شاعری پر اصولِ فن کے مطابق بحث کی، اور آج معنوی حیثیت سے اردو لٹریچر میں بھی مقدمہ فنِ تنقید کا بہترین نمونہ خیال کیا جاتا ہے۔"

ڈاکٹر عابد حسین لکھتے ہیں:

"۱۸۹۳ء میں حالی نے اپنی قدیم اور جدید غزلوں کا مجموعہ ایک مقدمے کے ساتھ شائع کیا جس میں شعر و شاعری کی حقیقت پر نہایت دل چسپ اور نتیجہ خیز بحث کی ہے۔ اسی سے اردو زبان میں علمی تنقید کی بنیاد پڑی، ورنہ اس سے پہلے تنقید صرف اس کا نام تھا کہ شعر عروض کے کانٹے میں تولا

جائے اور ہر لفظ اور ہر محاورے کی سند استادوں کے کلام سے طلب کی جائے۔ حالی نے اس مقدمے میں فنِ شعر خصوصاً اردو شاعری کا وہ دستور العمل مرتب کر دیا ہے جو شعر کہنے والوں اور پڑھنے والوں کے لئے ہمیشہ شمع ہدایت کا کام دے گا۔"

اور کلیم الدین کا کہنا ہے:

"اردو میں نئی تنقید کی ابتدا حالی سے ہوتی ہے۔ اردو تنقید کی دنیا مخذوف و مقصود کے جھگڑوں زبان و محاورات کی صحت، استاد کی ہنگامہ آرائی تک محدود تھی۔ حالی نے سب سے پہلے جزئیات سے قطع نظر کر کے بنیادی اصول پر غور و فکر کی۔ شعر و شاعری کی بصیرت پر کچھ روشنی ڈالی اور مغربی خیالات سے استفادہ کیا۔ اپنے زمانے، اپنے ماحول، اپنے حدود میں حالی نے جو کچھ کیا وہ لائقِ ستائش ہے حالی صرف اردو تنقید کے بانی ہی نہیں، اس وقت تک اردو کے بہترین نقاد بھی ہیں۔"

نتیجہ ان اقتباسات سے یہی نکلتا ہے کہ تنقید کے

باب میں حالی کو اوّلیت کا شرف بھی حاصل ہے اور اس وقت تک اردو کے بہترین نقاد ہونے کی فضیلت بھی۔ درحقیقت یہ خیال تو بہت عام ہے کہ وہ اردو کے پہلے باقاعدہ نقاد تھے، مگر اس امر کا احساس شاید کچھ بہت عام نہیں کہ اردو کی ادبی تنقید میں جس بصیرت و شعور کا ثبوت انھوں نے دیا وہ آج کم و بیش نصف صدی گزر جانے پر بھی، اور شعر و ادب اور نقد و نظر اور تصنیف و تالیف کے سارے ہنگاموں کے باوجود ہماری تنقیدی سوجھ بوجھ کی آخری حد ہے۔

○

مقدمۂ شعر و شاعری میں جن مطالب اور مباحث کو پیش کیا گیا ہے اُن کے مطالعے سے حالی کی وقتِ نظر، صحتِ فکر علمی دستگاہ، فنّی بصیرت اور ایک پختہ رچے ہوئے تنقیدی شعور کا پتہ چلتا ہے۔ تخلیقِ شعر کے نفسیاتی عمل سے آگاہی اور فن اور زندگی کے باہمی تعلق کا گہرا عرفان ہر جگہ موجود ہے ایشیائی شعر و ادب اُس کی تاریخ کے اہم موڑ اور ارتقائی مدارج اُس کے تمدنی ہیجات اور عمرانی موثرات، مختلف زمانوں میں اُس کے رجحانات و امیال، بدلتی ہوئی حالتوں میں اُس کا

مزاج و منہاج ——— اِن تمام امور سے مصنف کی گہری واقفیت کا ثبوت ہر مقام پر ملتا ہے۔ غیر شخصی اور معروضی نقطۂ نظر جس کی کارفرمائی ہر جگہ ملتی ہے ان سب اوصاف اور خصوصیات پر مستزاد ہے۔ شعر و شاعری کی اصلیت اور بنیادی حقیقت کے بارے میں جو بحثیں حالی نے پیش کی ہیں اور جو نظریات قائم کئے ہیں اُن میں وہ شاذ و نادر ہی اعتدال، توازن اور سنجیدگیٔ فکر کی حدود سے متجاوز ہوتے ہیں۔ چنانچہ اختلاف کی گنجائش کم نکلتی ہے۔ تاہم یہ نظریات و مباحث آخری لفظ کی حیثیت نہیں رکھتے۔ اِن سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے اور اُن پر اضافہ بھی ممکن ہے۔ شعر اور آرٹ کی ماہیت اور مقصد ایک ایسا موضوع ہے جس پر ارسطو کے زمانے سے اب تک بہت کچھ لکھا گیا ہے اور جس پر بے شمار نقطۂ ہائے نظر سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ کسی بھی عالمِ ادب یا نقادِ فن سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اِس موضوع پر کوئی ایسی تصنیف پیش کرے جو حرفِ آخر کا درجہ رکھتی ہو۔ پھر حالی تو اپنی زبان کے ادب میں فنِ تنقید کی بنیاد ڈال رہے تھے وہ ادب کی ایک ایسی صنف میں قلم اٹھا رہے تھے جو دراصل

مغربی ادب کی صنف تھی اور جس سے نہ صرف اردو بلکہ عربی و فارسی کے ادب کا دامن بھی اُس وقت تک خالی تھا۔ وہ اِس سلسلے میں جو کچھ کر گئے اُس سے زیادہ کی توقع اُن سے یا اُن کے زمانے کے کسی بھی عالمِ ادب سے نہیں کی جا سکتی تھی۔ ایسی حالت میں کلیم الدین کا حالی کی نقادانہ حیثیت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے "خیالات ماخوذ، واقفیت محدود، نظر سطحی، فہم و ادراک معمولی، غور و فکر ناکافی، تمیز ادنیٰ، دماغ و شخصیت اوسط" کا فیصلہ صادر کرنا بے جا لفاظی یا زورِ قلم کی بے محل نمائش سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ حالی کے نہ خیالات ماخوذ ہیں نہ واقفیت محدود ہے۔ مقدمۂ شعر و شاعری مشرقی علوم و ادبیات اور ادبی روایات سے گہری واقفیت کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے۔ اِسی گہری واقفیت کی بنیاد پر حالی نے اپنے تنقیدی نظریات کی عمارت کھڑی کی ہے۔ اِس عمارت کے استوار کرنے میں انھوں نے مغرب کے تنقیدی اصولوں سے بھی استفادہ کیا ہے اور گو مغرب کے تنقیدی ادب سے اُن کی واقفیت محدود ہے تاہم جو کچھ انھوں نے ..... وہاں سے اخذ کیا ہے اُس کو قابلیت اور سلیقے کے ساتھ برتا ہے۔ اور اُس سے

فائدہ اٹھانے میں کسی فاحش غلطی یا لغزش کے مرتکب نہیں ہوئے ہیں۔ نقدِ شعر کے جو بنیادی اصول حالی نے وضع کئے ہیں اُن کی صحت، معقولیت اور افادیت بھی ظاہر ہے۔ اور ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے یہ کہنا ہرگز قرینِ انصاف نہیں کہ اُن کے خیالات ماخوذ ہیں اور واقفیت محدود ہے۔ نہ یہ کہنا کوئی معنی رکھتا ہے کہ اُن کی نظر سطحی، ادراک معمولی، غور و فکر ناکافی، تمیز ادنیٰ اور دماغ و شخصیت اوسط درجے کی چیز ہے۔ اول تو یہ کوئی سنجیدہ اندازِ نقد نہیں۔ ادبی تنقید میں اِس قسم کی قطعیت اور اذعانیت بغایت ناروا چیز ہے۔ دوسرے یہی امر کہ مقدمۂ شعر و شاعری آج بھی ایک زندہ تصنیف ہے اور اس کی اہمیت اور ضرورت آج بھی بدستور قائم ہے اس دعوے کی کھلی ہوئی تکذیب ہے۔ سطحی نظر اور ادنیٰ تمیز کے بل بوتے پر جو کام کیا جاتا ہے وہ نسلوں اور زمانوں پر حاوی نہیں ہوتا۔ نہ امتدادِ وقت کے مہیم تخریبی عمل کا حریف ثابت ہو سکتا ہے۔ کسی تنقیدی کارنامے کا پچاس ساٹھ سال (اور پچاس ساٹھ سال بھی ایسے زمانے کے جو مغربی علوم و افکار کی بے پناہ یورش کا زمانہ ہو) گزر جانے پر بھی زندہ و

پائندہ اور مفید و بامعنی ہونا اِس امر کا کافی ثبوت ہے کہ وہ کارنامہ اور چاہے جو کچھ ہو، سطحی نظر اور ادنیٰ تمیز کی پیداوار ہرگز نہیں ہو سکتا۔ فرض کیجئے کہ دنیا کے عظیم اور برگزیدہ مصنف ہومر، ورجل، ڈانٹے، شیکسپیر، گوئٹے، کالیداس، فردوسی خیام، حافظ، غالب، ٹیگور اور ٹالسٹائے ہیں۔ تو کیا۔

اِس کا یہ مطلب ہوگا کہ جو اہل قلم اس فہرست میں شامل نہیں ہیں اُن کی نظر سطحی اور تمیز ادنیٰ ہے۔ اِس فہرست میں تو ڈرائڈن، کولرج اور میتھیو آرنلڈ جیسے نقاد بھی نہیں آتے۔ لیکن نہ اُن کی نظر کو سطحی کہا جا سکتا ہے، نہ تمیز کو ادنیٰ قرار دیا جا سکتا ہے،..... اور نہ دماغ و شخصیت ہی کو ادنیٰ درجے کی چیز گردانا جا سکتا ہے۔ حالی کی شاعری سے بحث نہیں، جہاں تک تنقید کا تعلق ہے اُن کی ژرف نگاہی، ادبی نبض شناسی، فنی بصیرت، اور عرفان و ادراک کا جواب نہیں۔ وہ عظیم اور برگزیدہ مصنفوں کی صف کے ادیب نہ سہی، اُن کے ضمن میں سطحی، ادنیٰ اور اوسط وغیرہ لفظوں کا استعمال بھی سراسر غلط اور نازیبا ہے۔

آگے چل کر کلیم الدین لکھتے ہیں :

"مقدمہ شعر و شاعری میں مغربی اور مشرقی
خیالات ایک جگہ مضحک طور پر جمع ہو گئے ہیں۔"

یہ بھی ایک دعوئ بے دلیل ہے۔ مقدمہ کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف نے شعر و شاعری پر نہایت منظم، باقاعدہ اور منطقی انداز میں بحث کی ہے۔ مطالب میں تجزیہ تحلیل، تشریح و تفسیر اور ترتیب و تنظیم کے لحاظ سے کہیں پیچیدگی یا ژولیدگی نہیں پائی جاتی۔ شروع سے آخر تک پوری بحث ایک سلجھے ہوئے دماغ کی پیداوار معلوم ہوتی ہے اور منطقی استدلال کا بہت اچھا نمونہ پیش کرتی ہے۔ مشرق اور مغرب کے جن تنقیدی خیالات یا نظریات سے مقدمہ کا ڈھانچہ تیار کیا گیا ہے وہ ایک میکانکی یا بیمونانہ انداز میں نقل نہیں کر لئے گئے ہیں، بلکہ مصنف نے پہلے اُن کو اچھی طرح سمجھا ہے، پرکھا ہے، اپنے مزاج میں رچایا ہے، محسوس کیا ہے، ہضم کیا ہے، اور پھر ایک آزاد تخلیقی عمل کے ماتحت اُن کی مدد سے نقدِ شعر کے بنیادی اصول وضع کئے ہیں، اور اُن اصولوں کی کسوٹی پر اردو شاعری کی مختلف اقسام و اصناف کو جانچا ہے، اور ادبی روایات و اسالیب کا جائزہ لیا ہے۔

مختلف مباحث میں نقّالی کا رنگ یا تنقیدی خیالات میں ادھ کچرا پن نہیں پایا جاتا، بلکہ تازگی، پختگی اور رچاؤ کا احساس ہوتا ہے۔

○

ادراک، بصیرت، سوجھ بوجھ، بالغ نظری اور ذاتی رائے کی صلاحیت ——— یہ وہ اوصاف ہیں جو ایک نقاد کو حقیقی معنوں میں نقاد بناتے ہیں۔ یہ اوصاف ایک طرف، مطالعے کی وسعت سے اور دوسری طرف صحتِ ذوق اور سلامتِ طبع سے پیدا ہوتے ہیں۔ پہلی چیز اکتساب سے تعلق رکھتی ہے، اور دوسری خصوصیت اکتسابی ہونے کے ساتھ ساتھ کسی حد تک وہبی و فطری بھی ہے۔ عالی وسیع المطالعہ ہونے کے ساتھ ساتھ صحتِ ذوق اور سلامتِ طبع سے بہرۂ وافر رکھتے تھے، اور اسی بنا پر اُن کی تنقید میں گہری سوجھ اور ذاتی اور آزادانہ رائے کی کمی نہیں۔ مقدمہ شعر و شاعری میں ایسے ٹکڑے بکثرت ملتے ہیں جو ان خصوصیتوں پر مبنی ہونے کے باعث اردو تنقید کی معراج ہیں اور جن کو تنقید کے شہ پارے کہا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اقتباسات

ملاحظہ ہوں :-

"اکثر لوگوں کی یہ رائے ہے کہ جو شعر شاعر کی زبان یا قلم سے فوراً بے ساختہ ٹپک پڑتا ہے وہ اُس شعر سے زیادہ لطیف اور بامزہ ہوتا ہے جو بہت دیر میں غور و فکر کے بعد مرتب کیا گیا ہو۔ پہلی صورت کا نام انھوں نے آمد رکھا ہے اور دوسری کا آورد۔ بعضے اِس موقع پر یہ مثال دیتے ہیں کہ جو شیرہ انگور سے خود بخود ٹپکتا ہے وہ اُس شیرے سے زیادہ لطیف و بامزہ ہوتا ہے جو انگور سے نچوڑ کر نکالا جائے۔ مگر ہم اِس رائے کو تسلیم نہیں کرتے۔ اول تو یہ مثال جو اِس موقع پر دی جاتی ہے اُسی سے اِس رائے کے خلاف ثابت ہوتا ہے۔ جو شیرہ انگور سے خود بخود اُس کے پک جانے کے بعد ٹپکتا ہے وہ یقیناً اُس شیرے کی نسبت بہت دیر میں طیار ہوتا ہے جو ادھ کچرے انگور سے نچوڑ کر نکالا جاتا ہے۔ مستثنےٰ حالتوں کے سوا ہمیشہ وہی شعر زیادہ مقبول، زیادہ لطیف، زیادہ بامزہ، زیادہ سنجیدہ، اور زیادہ موثر ہوتا ہے

جو کمال غور و فکر کے بعد مرتب کیا گیا ہو۔ یہ ممکن ہے کہ شاعر کسی موقع پر پاکیزہ خیالات جو اُس کے حافظے میں پہلے سے ترتیب وار موجود ہوں مناسب الفاظ میں جو حسنِ اتفاق سے فی الفور اُس کے ذہن میں آجائیں ادا کر دے۔ لیکن اول تو ایسے اتفاقات شاذ و نادر ظہور میں آتے ہیں والنادر کالمعدوم۔ دوسرے اُن خیالات کو جو مدت سے انگور کے شیرے کی طرح اُس کے ذہن میں پک رہے تھے کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ وہ جھٹ پٹ بغیر غور و فکر کے سرانجام ہو گئے ہیں ..... سچ یہ ہے کہ کوئی نظم جس نے کہ استقلال کے ساتھ جمہور کے دل پر اثر کیا ہو، خواہ طویل ہو خواہ مختصر، ایسی نہیں ہے جو بے تکلف لکھ کر پھینک دی گئی ہو۔ جس قدر کسی نظم میں زیادہ بے ساختگی اور آمد معلوم ہو اُسی قدر جاننا چاہیئے کہ اس پر زیادہ محنت، زیادہ غور اور زیادہ حک و اصلاح کی گئی ہو گی۔"

وہ شاعر کی معراجِ کمال یہ ہے کہ اُس کا عام کلام ہموار اور اصول کے موافق ہو اور کہیں کہیں اُس میں ایسا

حیرت انگیز جلوہ نظر آئے جس سے شاعر کا کمال خاص و عام کے دلوں پر نقش ہو جائے۔ البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ اُس کے عام اشعار بھی خاص خاص اشخاص کے دل پر خاص خاص حالتوں میں تقریباً ویسا ہی اثر کریں جیسا کہ اُس کا خاص کلام ہر شخص کے دل پر ہر حالت میں اثر کرتا ہے۔"

"ہر زبان میں نیچرل شاعری ہمیشہ قدما کے حصے میں رہی ہے۔ مگر قدما کے اول طبقے میں شاعری کو قبولیت کا درجہ حاصل نہیں ہوتا۔ اُنھیں کا دوسرا طبقہ اُس کو سڈول بناتا ہے اور سانچے میں ڈھال کر اُس کو خوش نما اور دل رُبا صورت میں ظاہر کرتا ہے۔ مگر اُس کی نیچرل حالت کو اِس خوش نمائی اور دل رُبائی میں بھی بدستور قائم رکھتا ہے۔ اِن کے بعد متاخرین کا دورہ شروع ہوتا ہے مگر یہ لوگ قدما کی تقلید سے قدم باہر نہیں رکھتے اور خیالات کے اُسی دائرے میں محدود رہتے ہیں جو قدما نے ظاہر کئے تھے، اور نیچرل کے اُس منظر سے جو قدما کے پیشِ نظر تھا آنکھ اُٹھا کر دوسری

طرف نہیں دیکھتے تو اُن کی شاعری رفتہ رفتہ نیچرل حالت سے تنزل کرتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ نیچرل کی راہِ راست سے بہت دور جا پڑتے ہیں۔ اِس کی مثال ایسی سمجھنی چاہیئے کہ ایک باورچی نے ایسے مقام پر جہاں لوگ سالم کچے اور اونے ماش یا مونگ پانی میں بھیگے ہوئے کھاتے تھے اُنھیں پانی میں اُبال کر اور نمک ڈال کر لوگوں کو کھلایا۔ انھوں نے اپنی معمولی غذا سے اُسی کو بہت غنیمت سمجھا۔ دوسرے باورچی نے ماش یا مونگ دلوا کر اور دال کو دھو کر اور مناسب مصالحہ اور گھی ڈال کر کھانا تیار کیا۔ اب تیسرے باورچی کو اگر وہ دال ہی پکانے میں اپنی استادی ظاہر کرنا چاہتا ہے اِس کے سوا اور کوئی موقع تنوع پیدا کرنے کا باقی نہیں رہا کہ وہ مقدارِ مناسب سے زیادہ مرچیں اور کھٹائی اور گھی ڈال کر ..... لوگوں کو اپنی چٹ پٹی ہانڈی پر فریفتہ کرے۔"

"عوام محاورہ یا روزمرہ کے ہر شعر کو سُن کر سر دُھننے لگتے ہیں۔ اگرچہ شعر کا مضمون کیسا ہی مبتذل یا رکیک اور مبہم ہو اور اگرچہ محاورہ کیسا ہی

بے سلیقگی سے باندھا گیا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جن اسلوبوں میں وہ ایک دوسرے سے بات چیت کرتے ہیں، جب اُنھیں اسلوبوں میں وزن کی کھچاوٹ اور قافیوں کا تناسب دیکھتے ہیں اور معمولی بات چیت کو شعر کے سانچے میں ڈھلا ہوا پاتے ہیں تو اُن کو ایک نوع کا تعجب اور تعجب کے ساتھ خوشی پیدا ہوتی ہے۔ مگر خواص کی پسند اور تعجب کے لئے صرف روزمرہ کا وزن کے سانچے میں ڈھال دینا کافی نہیں ہے ...."

"جن لوگوں کی طبیعت پر غزلیت کا رنگ غالب ہے اُن سے مثنوی کے فرائض اچھی طرح انجام نہیں ہو سکتے۔ باورچیوں میں یہ مقولہ مشہور ہے کہ پتیلی پکانے والے سے دیگ اچھی نہیں پک سکتی جو نسبت پتیلی کو دیگ کے ساتھ ہے وہی نسبت غزل کو مثنوی کے ساتھ ہے۔ جس طرح پتیلی پکانے والے کو دیگ کے نمک پانی اور آنچ کا اندازہ معلوم نہیں ہو سکتا اُسی طرح جو لوگ غزل میں منہمک ہو جاتے ہیں اور اُن پر غزلیت کا رنگ چڑھ جاتا ہے، وہ مثنوی

کی ترتیب اور انتظام سے اکثر عہدہ برآ نہیں ہوتے۔"

○

تخلیقی تنقید اُس وقت وجود میں آتی ہے جب نقاد زیرِ بحث مصنف یا فن کار کے دل کی نبض کو چھو لیتا ہے۔ اُس کے دماغ میں اُتر جاتا ہے۔ اُس کی روح میں جھانکتا ہے۔ اور اُس طرح اُن ذہنی کیفیات کا سراغ لگا لیتا ہے جن کے زیرِ اثر اُس مصنف یا فن کار نے اپنے تخلیقی کارنامے کو سرانجام کیا تھا۔ نقاد اِن ذہنی کیفیات کو اپنے اوپر بالکل اِس طرح طاری کر لیتا ہے جس طرح وہ مصنف یا فن کار پر طاری تھیں۔ پھر وہ اُن کو جانچتا ہے، پرکھتا ہے۔ زندگی اور زمانے سے مربوط کر کے اُن کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ لگاتا ہے۔ اور یوں پڑھنے والے کے لئے وہی جمالیاتی حظ فراہم کرتا ہے جو خود تخلیقی کارنامے کی بدولت پیدا ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ تخلیقی تنقید صرف اُس نقاد کا کام ہو سکتا ہے جو اعلیٰ نقادانہ اوصاف کے ساتھ تخلیقی صلاحیتیں بھی رکھتا ہو۔ حالی اِس منصب کے اہل معلوم ہوتے ہیں۔ اور مقدمۂ شعر و شاعری کے متعدد مقامات تخلیقی تنقید کے کامیاب نمونے ہیں۔ تخیل

کی تعریف و تصریح کے سلسلے میں غالب اور حافظ کے اشعار کی جو تشریح کی گئی ہے اُس کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

○

مقدمہ شعر و شاعری کے مطالب و مباحث سے ہٹ کر جب ہم زبان و بیان پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ حالی نے اردو تنقید کو جو زبان اور اندازِ بیان اور لب و لہجہ عطا کیا اُس کی حیثیت آج تک مثالی ہے۔ وہ زبان کے معاملے میں غیر ضروری آرائش و زیبائش سے کام نہیں لیتے۔ لفاظی، عبارت آرائی، خالی خولی انشا پردازی اور نری رنگ آمیزی سے مکمل طور پر اجتناب کرتے ہیں۔ اِس کے ساتھ ساتھ وہ بے رنگ یا بے لطف زبان بھی نہیں لکھتے۔ اُن کی تحریر میں حقیقی ادبی چاشنی اور سچی ادبی شائستگی پائی جاتی ہے۔ اُن کے یہاں جو متانت ہے وہ بڑی خوش گوار اور بڑی بلیغ متانت ہے۔ اُن کی سنجیدگی ایک شگفتہ سنجیدگی ہے۔ مقدمہ زبان اور اندازِ بیان کی وہ ساری لطافتیں اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے جو حالی کی نثر کا جوہر ہیں۔

اردو کے تنقیدی حلقوں میں حالی کی نثر کے متعلق ایک مدت سے یہ خیال رائج و مقبول ہے کہ وہ ایک صاف ستھرا، مگر معمولی، عمومی اور سیدھا سادھا اسلوبِ تحریر ہے جس میں نہ کوئی جدت و ندرت ہے، نہ رنگینی و رعنائی، نہ لطف و لذت ہے نہ کیف و حلاوت، نہ ادبی حسن کاری ہے نہ انشا پردازانہ صناعی۔ نیز یہ کہ اردو کے "عناصرِ خمسہ" میں سرسید، نذیر احمد، آزاد اور شبلی صاحب طرز ادیب ہیں، لیکن حالی صاحبِ طرز نہیں ہیں۔ مزید یہ کہ شبلی اسلوب کی لطافت، خوبصورتی اور زیبائش کے لحاظ سے حالی سے بہت بڑھے ہوئے ہیں۔ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ تنقیدی منشور کب ایجاد ہوا اور کیونکر ایجاد ہوا۔ البتہ اتنی بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ وہ کوئی بہت ہی عجیب اور بہت ہی مخصوص نوعیت کی گھڑی ہوگی جس میں یہ ادبی فیصلہ مرتب ہوا اور نشر کیا گیا۔ اردو تنقید کی فضا اُسے بے حد راس آئی اور آج تک بڑے احترام اور پوری احتیاط کے ساتھ ایک مقدس ملفوظ کے طور پر اُس کا وِرد کیا جاتا رہا ہے۔ تقریباً ہر نقاد نے حالی کی نثر کو معمولی اور اُن کے ہم عصروں خصوصاً شبلی کی نثر کو غیر معمولی قرار دیا ہے۔

زبان و ادب کا مورخ عام مزعومات، مروجہ معتقدات اور معروف تنقیدی رایوں کی روشنی میں اپنے بیانات قلمبند کرتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حالی کی نثر سے متعلق اردو نثر کے مورخ کا یہ بیان بھی عام عقیدے کے عین مطابق ہے:۔

"اُن کے ہاں سرسید کا جوش، آزاد کی رنگینی، نذیر احمد کا زور و شور اور ظرافت نہیں ہے، لیکن قوتِ بیان اور فصاحت و روانی بہتر سے بہتر ہے۔ حالی کا طرز سرسید سے زیادہ مشابہ ہے۔ حالی نے سرسید کے اسلوب و بیان کی قدامت کو زبانِ حال کے مطابق کر دیا ہے۔ لیکن سرسید کے جوشِ بیان، تیزیٔ طبع، ملکۂ ایجاد، اور تنوعِ اسالیب کی حالی میں کمی ہے۔ مولانا حالی واقعی مولانا تھے، صاحبدل، درویش مزاج، خاموش، متین۔ اُن کے علم و فضل میں وسعت اور ذہن و فکر میں روشنی تھی، لیکن دل اور مزاج میں گرمی اور تیزی نہ تھی۔ انھوں نے غور و فکر کے ساتھ، اردو زبان و ادب کا جائزہ لیکر، اُس کی خامیوں کو دیکھکر، ضرورتوں کو سمجھکر، دوسری زبانوں سے مقابلہ کر کے، جدید موضوعات کی

کتابیں لکھ دیں۔ لیکن اپنی تحریر و اسلوب کے لئے کوئی روشِ خاص پیدا نہ کر سکے۔ صاحبِ طرز بننے کے معنی ہیں تقلید کو چھوڑ کر موجد بننا، موجودہ روش سے بغاوت کرنا، اور اپنی راہ الگ نکالنا۔ یہ اُس وقت ہوتا ہے جب کسی ادیب و مصنف کے اندر فطری اپج ہو۔ اور اُس کی ایک دُھن، شوق، جوش ہو۔ انشاء اللہ خاں، مرزا غالب، سرسید، آزاد، نذیر احمد، شبلی کی ایجادیں اور اختراعیں اِسی صفت کے مظاہر اور آثار ہیں۔ اور اِسی صفت کے نہ ہونے سے مولوی ذکاء اللہ اور مولانا حالی صاحبِ طرز نہیں ہیں۔

——— مولانا حالی کی تحریروں میں موضوع و مضمون کی جدّت، بیان کی صداقت، زبان کی صحت، اسلوب کی صفائی، دلائل کی قوت، تمثیلات کی برجستگی، سب کچھ ہے اور اکثر بے عیب ہے، بلکہ بعض جگہ نادر و بدیع بھی ہے۔ لیکن اِن کی عبارت پڑھنے سے ادبی مسرت حاصل نہیں ہوتی، انشاپردازی کا نشاط و اہتزاز پیدا نہیں ہوتا۔ تاہم اُن کی سچی تلی

تحریر کا اثر ہوتا ہے۔ اس لئے حالی کوئی خاص صاحب طرز نہیں ہیں، لیکن صحیح و با اصول ادیب ہیں۔"

حالی کی نثر کے سلسلے میں تحسین آمیز تنقیص کا یہ رویّہ بہت عام ہے اور اس کو اردو تنقید کی محدود اور ناقص بصیرت کے سوا اور کسی چیز سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ حالی نہ صرف اپنے دور کے بلکہ انیسویں صدی کے بہترین نثر نگار ہیں۔ اُن کی تحریر میں صحت، پختگی، توازن، تناسب، متانت، روانی، صفائی اور ہمواری کے ساتھ ساتھ حسن و موزونیت بھی بیش از بیش ہے۔ اُس میں ادبی مسرت کا سامان بھی ہے اور انشا پردازی سے پیدا ہونے والا نشاط و اہتزاز بھی۔ البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ یہ تمام اوصاف سطحی و قشری ہونے کی بجائے ایک گہرے، مہذب، رچے ہوئے اور منجھے ہوئے انداز میں پائے جاتے ہیں اور فنی ضبط و احتیاط کے بنیادی وصف کے ساتھ پورے طور پر سموئے ہوئے ہیں۔ اُن کی حیثیت اوپری ٹیم ٹام کی نہیں ہے۔ بلکہ وہ لفظوں، فقروں اور جملوں کے خارجی پیکر میں روح کی طرح جاری و ساری ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اُن سے لطف اندوز ہونے

کے لیے ایک بہت ہی پختہ اور تربیت یافتہ ادبی ذوق کی ضرورت ہے۔ اور یقیناً حالی ایک صاحبِ طرز ادیب بھی تھے۔ اُن کا طرز خارجی مشاطگی یا ظاہری طمطراق یا نمائشی ابلیلے پن سے پیدا ہونے والا طرز نہیں ہے۔ وہ نہ پینترے بازی سے عبارت ہے نہ اتراہٹ اور تبختر کا دوسرا نام ہے۔ وہ دراصل ایک ایسا طرز ہے جو گہرے داخلی خلوص اور ٹھوس خارجی ممارست کے باہمی تعاون اور دانش وری و فن کاری کے صمیمی اتحاد سے وجود میں آتا ہے۔ پھر اگر طرز و اسلوب کے کسی محدود تصور کے پیشِ نظر اُن کو صاحبِ طرز نثر نگار کا درجہ دینے سے انکار بھی کیا جائے تو ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اعلیٰ درجے کا نثر نگار ہونا صاحبِ طرز ادیب ہونے سے زیادہ بڑا امتیاز ہے، کیونکہ صاحبِ طرز ادیب ہونے کا منصب تو بعض اوقات دوسرے درجے کے نثر نگار کو بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ انیسویں صدی کے لکھنے والوں میں میر امن، غالب، آزاد اور نذیر احمد بے شک صاحبِ طرز لکھنے والے ہیں۔ لیکن اِن کے نامور اسلوبوں کی حدود بھی عام نظروں سے پوشیدہ نہیں۔ سب جانتے ہیں کہ صرف ایک مخصوص اور محدود دائرے میں اُن کا جادو چلتا ہے۔ اُس

دائرے کے باہر وہ طلسم باطل کی حیثیت رکھتے ہیں، اور کبھی کبھی (جیسا کہ نذیر احمد اور محمد حسین آزاد کی تحریروں سے ظاہر ہے) اپنے موجد و خالق کو بھی اپنے ساتھ لے ڈوبتے ہیں۔ باقی رہے سرسید اور شبلی اور اُن کے اسلوب، تو اول تو یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی کہ اگر سرسید اور شبلی صاحب طرز ہیں تو حالی صاحبِ طرز کیوں نہیں ہیں؟ دوسرے یہ کہ حالی کی نثر سرسید کی نثر سے تو خیر ممتاز و افضل ہے ہی، لیکن اگر نقادوں کے منقولات سے قطع نظر کرتے ہوئے ذاتی اور آزادانہ مطالعے کی روشنی میں دیکھا جائے تو شبلی کی نثر سے بھی بدیہی طور پر زیادہ سڈول، زیادہ فصیح و ہموار اور زیادہ خوش آہنگ ہے۔ اور ہرگز کوئی وجہ نہیں کہ نثر نگاری کے باب میں حالی کو بمراتب بلند تر نہ خیال کیا جائے۔

یہ سب باتیں جو حالی کی عام نثر نگاری کے بارے میں کہی گئیں، مقدمۂ شعر و شاعری کی نثر کے بارے میں اور زیادہ قوت کے ساتھ کہی جا سکتی ہیں۔ یہاں یہ سوال اُٹھانے کی نہ گنجائش ہے نہ ضرورت کہ حالی کی نثر کا بہترین نمونہ مقدمہ ہے یا اُن کی کوئی دوسری تصنیف مثلاً حیاتِ جاوید۔ البتہ اتنی

بات اصرار کے ساتھ کہنے کی ضرورت ہے کہ مقدمہ شعر و شاعری حالی کی نثر کے بہترین اوصاف کا عکاس ہے اور اردو میں اِس سے بہتر تنقیدی نثر موجود نہیں۔

حالی کے اسلوبِ خاص کی نمائندگی کے لئے مقدمہ شعر و شاعری سے یہ دو اقتباس پیش کئے جا سکتے ہیں :۔

"غزل کو جن لوگوں نے چمکایا اور مقبولِ خاص و عام بنایا ہے، یہ وہ لوگ تھے جو آج تک اہل اللہ اور صاحبِ باطن یا کم سے کم عشقِ الٰہی کا راگ گانے والے سمجھے جاتے ہیں۔ جیسے سعدی، رومی، خسرو حافظ، عراقی، مغربی، احمد جام اور جامی وغیرہم۔ اِن بزرگوں سے پہلے غزل کی طرف زیادہ اعتنا نہیں پایا جاتا۔ ہم نے حیاتِ سعدی میں کسی موقع پر بیان کیا ہے کہ اُن کی غزل کا موضوع جیسا کہ ظاہر الفاظ سے مفہوم ہوتا ہے عشقِ مجازی نہ تھا، بلکہ وہ حقیقت کو مجاز کے پردے میں ظاہر کرتے یا یوں کہو کہ چھپاتے تھے۔ اُن کے ایک ایک لفظ سے پایا جاتا ہے کہ وہ عشق و محبت کے رنگ میں شور بور تھے۔ اُن کے کلام میں

ضرور کوئی ایسی چیز ہے جس کو روحانیت کے ساتھ تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اُن کی غزل سُن کر دنیا کی بے ثباتی اور بے اعتباری کا سماں دل پر چھا جاتا ہے۔ وہ خط و خال کا ذکر اِس طرح کرتے ہیں جس سے شاہد پرستی کی ترغیب نہیں بلکہ دنیا پرستی سے نفرت ہوتی ہے۔ وہ شراب کی بدمستی کو دنیا دار مکاروں کی ہوشیاری سے بہتر بتاتے ہیں۔ وہ رندی و بدنامی و رسوائی کو صوفیوں کی دلق طمع اور زاہدوں کے زہدِ ریائی پر ترجیح دیتے ہیں۔ وہ کوئی گناہ مکر و ریا سے، کوئی حماقت غرورِ مال و جاہ سے، کوئی شرک خود پرستی و نفس پرستی سے، اور کوئی دھوکا دنیا سے بڑھ کر نہیں بتاتے۔ اُن کا کوئی کلام اثر سے خالی نہیں۔ اور اِس سے ظاہر ہے کہ انھوں نے جو کچھ کہا ہے وہ اُن کے دل سے نکلا ہے۔"

"فقہا اور اہلِ ظاہر ہمیشہ دو فرقوں کے سخت مخالف رہے ہیں۔ ایک اہلِ باطن کے، دوسرے اہلِ رائے کے۔ فقہا کے فتووں سے اِن دونوں

گروہوں کو ہمیشہ سخت نقصان پہنچتے رہے ہیں۔ قتل کئے گئے ہیں۔ دار پر چڑھائے گئے ہیں۔ مشکیں بندھی ہیں۔ کوڑے کھائے ہیں۔ قیدیں بھگتی ہیں۔ جلاوطن کئے گئے ہیں۔ کتابیں جلائی گئی ہیں۔ اور اور کیا کیا کچھ ہوا ہے۔ جب کہ فقہا کی مخالفت کا اُن لوگوں کے ساتھ یہ حال تھا تو یہ بھی اپنی تصنیفات میں نثر ہو یا نظم خوب دل کے مجّارات نکالتے تھے بقول شخصے کسی کا ہاتھ چلے کسی کی زبان۔ فقہا دو اغظین اُن کے اقوال و افعال پر گرفت کرتے تھے۔ اُنھوں نے اُن کے اخلاق کی قلعی کھولنی شروع کی۔ وہ کہتے تھے کہ یہ لوگ خلافِ شرع کام کرتے ہیں۔ اِنھوں نے کہا شراب خواری و قمار بازی جو اکبر الکبائر ہیں وہ بھی جو فروشی و گندم نمائی سے بہتر ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ یہ لوگ خلاف شرع باتیں کہتے ہیں۔ اِنھوں نے کہا، علانیہ کفر بکنا اِس سے بہتر ہے کہ دل میں کفر ہو اور زبان پر اسلام۔ وہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرتے تھے۔ اِنھوں نے

کہا کہ اوروں کو ہدایت کرنے اور آپ گمراہ رہنے سے بڑھکر
کوئی گناہ نہیں۔ وہ کہتے تھے کہ تم لوگ حقوق الٰہی ادا
نہیں کرتے۔ انھوں نے کہا کہ تم حقوقِ عباد میں
خیانت کرتے ہو۔ الغرض شعرائے متصوفین نے
جو اہل ظاہر پر خرہ گیریاں کی ہیں۔ وہ اسی قسم کی
تعریضات اور مطارحات ہیں۔"

○

شوخی یا بانکپن یا مزاحیہ و طنزیہ پیرایۂ بیان ایسی چیزیں
ہیں جن کو حالی کی نثر نگاری سے بظاہر کوئی واسطہ نہیں۔ مگر
یہ ایک دل چسپ حقیقت ہے کہ مقدمہ جس میں حالی کے
لئے اپنے عام طرزِ تحریر سے انحراف کرنے کی کم سے کم
گنجائش یا امکان تھا، زبان و بیان کی شگفتگی کی بے شمار
مثالیں اپنے اندر رکھتا ہے۔ اور یہ شگفتگی بعض مقامات پر
شوخی یا مزاح کی حدود میں بھی داخل ہو جاتی ہے۔ مثلاً یہ
چند اقتباسات پیش کئے جا سکتے ہیں:۔

"وہ مدح سے پہلے ایک تمہید لکھتا ہے
جس میں یا تو فصل بہار کا ذکر ہوتا ہے (اگرچہ اُس

وقت خزاں ہی کا موسم ہو) مگر اُس ذکر میں اِس ناپاک دنیا کی فصلِ بہار سے کچھ بحث نہیں ہوتی، بلکہ ایک اور عالم سے بحث ہوتی ہے جو عالمِ امکان سے بالاتر ہے۔ یا زمانہ، آسمان، نصیب، یا قسمت کی شکایت ہوتی ہے۔ جس کو درحقیقت خدا کی شکایت سمجھنا چاہیے، جو زمانہ وغیرہ کی آڑ میں خوب دل کھول کر کی جاتی ہے۔ اِس میں بھی شاعر اپنے واقعی مصائب بیان نہیں کرتا، اور نہ ممدوح کو اپنے اوپر رحم دلانے کی باتیں کہتا ہے، بلکہ جس قسم کے مصائب اگلے زمانے کے شعرا نے اپنی نسبت بیان کئے تھے اور جیسے بہتان انھوں نے آسمان و زمانہ وغیرہ پر باندھے تھے یہ بھی بہ ادنیٰ تغیر ویسے ہی مصائب بیان کرتا ہے اور اُسی قسم کے بہتان باندھتا ہے۔"

"مدح میں اکثر ایک نام کے سوا کوئی خصوصیت ایسی مذکور نہیں ہوتی جو ممدوح کی ذات کے ساتھ مختص ہو، بلکہ ایسے حاوی الفاظ میں مدح کی جاتی

ہے کہ اگر بالفرض مداح اِس علت میں کہ فلاں شخص کی مدح کیوں کی، عدالت میں ماخوذ ہو جائے، تو قصیدے میں کوئی لفظ ایسا نہ ملے جس سے اُس کا جرم ثابت ہو سکے۔"

"ہماری مثنویوں کا یہ حال ہے کہ اُن میں معمولی حمد و نعت وغیرہ کے بعد اکثر پہلے کسی بادشاہ زادے یا وزیرزادے یا امیرزادے یا سوداگر بچے کے حسن و جمال وغیرہ کی تعریف ہوتی ہے۔ پھر اُس کو کسی پری یا شہزادی یا وزیرزادی یا اور کسی کے ساتھ لگا مارا جاتا ہے۔ وہ اول اُس کے فراق میں شہر شہر اور جنگل جنگل مارا مارا پھرتا ہے۔ پھر آخر کار وصل سے کامیاب ہوتا ہے۔ یہ کامیابی ایسی ضروری ہے کہ اُس کی نسبت پہلے ہی سے پیشین گوئی کی جا سکتی ہے۔"

"اگلوں نے معشوق کو اِس لئے کہ وہ گویا لوگوں کے دل شکار کرتا ہے، صیاد باندھا تھا۔ پچھلوں نے رفتہ رفتہ اُس پر تمام احکام حقیقی صیاد کے مترتب کر دیئے۔ اب وہ کہیں جال لگا کر چڑیاں پکڑتا

ہے، کہیں اُن کو تیر مار کر گراتا ہے، کہیں اُن کو زندہ پنجرے میں بند کرتا ہے۔ کہیں اُن کے پر نوچتا ہے۔ کہیں اُن کو ذبح کر کے زمین پر تڑپاتا ہے۔ جب کبھی وہ تیر کمان لگا کر جنگل کی طرف جا نکلتا ہے، تمام جنگل کے پنچھی اور پکھیرو اُس سے پناہ مانگتے ہیں۔ سینکڑوں پرندوں کے کباب لگا کر کھا گیا۔ بیسیوں پنجرے قمریوں اور کبوتروں اور کوؤں اور بٹیروں کے اُس کے دروازے پر ٹنگے رہتے ہیں۔ سارے چڑی مار اُس کے آگے کان پکڑتے ہیں۔"

"اِس شعر میں شیخ کا کوئی گناہ یا قصور سوا اِس کے کہ شیخ شیخ ہے۔ نہیں جتلایا گیا اور شعر میں اس کے سوا اور کوئی خوبی نہیں رکھی گئی کہ ایک مقدس آدمی پر دو پھبتیاں کہکر بھنگڑوں اور شرابیوں کی ضیافت طبع کی جلائے۔"

"اِس تقریر میں اکثر الفاظ بالکل بے محل استعمال ہوئے ہیں۔ بادشاہ خود شیخ فانی ہے، اور اُس کی ملکہ بھی عجوزِ سال خوردہ ہے۔ وہ خود جا بجا کہتی ہے کہ میں

یا در رکاب بیٹھی ہوں، اور چناں ہوں اور چنیں ہوں۔ باوجود اس کے ایسے الفاظ استعمال کرنے کہ اپنی بی بی سے گرمِ خلوت تھا، یا محوِ راحت اور مستِ عشرت تھا یا اُس پری رو یعنی بڑھیا نے اختلاط میں آکر عرض کی؛ یا بادشاہ کا اپنی بڑھیا ملکہ کو کہیں اے ماہ اور کہیں اے حور کہنا، یہ سب باتیں مقتضائے حال کے خلاف ہیں۔"

"تیسرے شعر کے سوا باقی تین شعروں کا مطلب کچھ نہیں معلوم ہوتا، اور ظاہراً اس نے کوئی مطلب رکھا بھی نہیں۔ اُس کو تو فقط یہ لطیفہ بیان کرنا مقصود ہے کہ کھانے کی جگہ قسمیں کھاتی تھی، پینے کی جگہ آنسو پیتی تھی، کپڑے کے عوض رنگ بدلتی تھی وغیرہ وغیرہ۔"

○

حالی کی ناقدانہ اہمیت کا راز دراصل اس امر میں ہے کہ وہ ایک ترقی پسند نقاد تھے۔ اُن کا ادبی اور تنقیدی شعور ترقی پسندانہ افکار و تصورات پر مبنی تھا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے

کہ حالی کا سماجی اور اجتماعی احساس بیدار تھا۔ وہ اپنے زمانے کی تاریخی قوتوں اور بنیادی حقیقتوں سے بخوبی واقف تھے۔ وہ یہ جانتے تھے کہ زندگی ایک تاریخی دور سے نکل کر دوسرے تاریخی دور میں داخل ہو چکی ہے۔ جاگیر دارانہ نظام زوال و انحطاط کا شکار ہو کر منہدم ہوا چاہتا ہے۔ اور نئے تجارتی اور صنعتی نظام کے نقوش آہستہ آہستہ اُبھر رہے ہیں۔ سماج کی بنیادی ساخت اور اساسی ترکیب منقلب ہو رہی ہے۔ پُرانی معاشی تنظیم پارہ پارہ ہو چکی ہے۔ اور ایک نیا تجارتی اور صنعتی نظام اُس کی جگہ لے رہا ہے۔ اقتصادی طبقات اُلٹ پُلٹ ہو کر نئی شکل میں مرتب ہو رہے ہیں۔ اور سماجی تعلقات بھی اُسی نسبت سے بدل رہے ہیں۔ الغرض حالی نئی تجارت، نئی صنعت و حرفت، نئی حکومت، نئے نظم و نسق، نئی تعلیم اور نئی معاشرت کے طلوع کا کسی نہ کسی حد تک واضح احساس رکھتے تھے۔ وہ اُن تبدیلیوں سے بھی بیگانہ نہیں تھے جو زندگی کے خارجی پیرہن کے ساتھ داخلی ہیئت میں رونما ہو رہی تھیں۔ یعنی نئے علوم، نئی تہذیبی قدریں، نئے سائنسی نظریے، اور نئے زاویہ ہائے فکر۔ یہ تمام نئے میلانات مجموعی حیثیت سے جس ذہنی

انقلاب کے ضامن یا نقیب تھے اُس سے حالی بے خبر نہیں تھے۔
پھر قدیم و جدید کی اِس آویزش میں ——— پرانے زمانے کی
موت اور نئے دور کی پیدائش کے اِس ہنگامے میں ———
اُن کا دل اور دماغ دونوں ابھرتی ہوئی طاقتوں کے ساتھ تھے۔
وہ ماضی کے عزادار نہیں تھے، مدوجزرِ اسلام کے مصنف ہونے
کے باوجود ماضی کے عزادار نہیں تھے۔ حال کی پذیرائی اور
مستقبل کا فکر و تردد اُن کے نزدیک ماضی کے سوگ سے زیادہ
اہم تھا۔ اُن کا یہ شعور اُس دور کے بعض دوسرے ادیبوں کے
شعور کی طرح ناپختہ یا ادھورا نہیں تھا۔ مثلاً رتن ناتھ سرشار
کے یہاں فکر و شعور کی وہ واضح سمت مفقود ہے جو ہمیں
حالی کے یہاں ملتی ہے۔ سرشار نے اپنے مادی اور خارجی
ماحول کی تبدیلی کو پورے طور پر بھانپ لیا تھا۔ مگر وہ ایک
قطعی اور فیصلہ کن انداز میں نئے زمانے اور نئے زمانے
کی قوتوں کے ساتھ نہیں تھے۔ اُن کا دماغ نئے دور کے
تقاضوں کا قائل ہو چکا تھا۔ مگر اُن کا دل قدامت کی زلفوں
کا اسیر تھا۔ وہ ایک کشاکش، جھجک اور دو دِلے پن میں مبتلا
تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے مرتے ہوئے سماج کے نہایت

کامیاب مرقعے پیش کئے، مگر آنے والے دور کا کوئی خاکہ بین السطر بھی پیش نہیں کر سکے۔ حالی کے عقائد بہت سلجھے ہوئے اور اُن کا نقطۂ نظر بہت صاف تھا۔ اُن کے ترقی پسندانہ شعور میں وضاحت، پختگی اور وثوق کی جو کیفیت ملتی ہے اُس کا ثبوت اُس دور کے کسی دوسرے ادیب کی ذہنی کاوشوں میں نہیں ملتا۔ اپنی متنوع ادبی تخلیقات میں انھوں نے جس پیہم تواتر کے ساتھ وقت کی تاریخی کروٹوں کو منعکس کیا ہے اور جس غیر مبہم انداز میں پرانے دور کی موت اور نئے دور کی پیدائش کا اعلان کیا ہے وہ ایک سرسری اور اچٹتی ہوئی نظر سے بھی پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔

مسدس خصوصی طور پر حالی کے بیدار سیاسی ضمیر اور عمرانی شعور کی یادگار ہے۔ اِس حیرت انگیز سیاسی نظم میں تاریخی تبدیلیوں کا عرفان اور سماجی ارتقا کے تقاضوں کا شاعرانہ احساس ایک غیر فانی ادبی نقش بنکر رہ گیا ہے۔ زندگی اور زمانے کی حرکی نوعیت کا اعلان مسدس کی زبان میں اِس طرح ہُوا ہے:۔

زمانے کا دن رات ہے یہ اشارہ
کہ ہے آشتی میں مری یاں گزارا
نہیں پیروی جن کو میری گوارا
مجھے اُن سے کرنا پڑے گا کنارا
سدا ایک ہی رُخ نہیں ناؤ چلتی
چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی

مسدس کے وہ تمام بند جن میں ایک طرف عام مسلمانوں کی پستی، بدحالی، نکبت، اور جہل و غفلت، اور دوسری طرف اہل ثروت کی بدتوفیقی اور بدقوارگی کا ذکر ہے دراصل جاگیری سماج کے تاریخی زوال کے خاکے اور تصویریں ہیں جن کو ہم حالی کی دانش ورانہ بصیرت کے آئینے میں دیکھتے ہیں۔ اِس دو رخی مرقعے کا ایک رخ تو یہ ہے:۔

بہت آگ چلموں کی سلگانے والے
بہت گھاس کی گٹھریاں لانے والے
بہت در بدر مانگ کر کھانے والے
بہت فاقے کر کر کے مر جانے والے

جو پوچھو کہ کس کان کے ہیں وہ جوہر
تو نکلیں گے نسلِ ملوک اُن میں اکثر
بہت آپ کو کہہ کے مسجد کے بانی
بہت بن کے خود سیدِ خاندانی
بہت سیکھ کر نوحہ و سوز خوانی
بہت مدح میں کر کے رنگیں بیانی
بہت آستانوں کے خدام بن کر
پڑے مانگتے کھاتے پھرتے ہیں در در
مشقّت کو محنت کو جو عار سمجھیں
ہنر اور پیشے کو جو خوار سمجھیں
تجارت کو کھیتی کو دشوار سمجھیں
فرنگی کے پیسے کو مُردار سمجھیں،
تن آسانیاں چاہیں اور آبرو بھی
وہ قوم آج ڈوبے گی گر کل نہ ڈوبی

اور دوسرا رُخ یہ ہے:-

ایسروں کا عالم نہ پوچھو کہ کیا ہے
خمیر اُن کا اور اُن کی طینت جدا ہے

سزاوار ہے اُن کو جو نا سزا ہے
روا ہے اُنھیں سب کو جو ناروا ہے
شریعت ہوئی ہے نکو نام اُن سے
بہت فخر کرتا ہے اسلام اُن سے
ہو اک بول پر اُن کے مجلس فدا ہے
ہر اک بات پر واں درست اور بجا ہے
نہ گفتار میں اُن کی کوئی خطا ہے
نہ کردار اُن کا کوئی نا سزا ہے
وہ جو کچھ کہ ہیں کہہ سکے کون اُن کو
بنایا ندیموں نے فرعون اُن کو
سمجھتے ہیں سب عیب جن عادتوں کو
بہائم سے نسبت ہے جن سیرتوں کو
چھپانے ہیں اوباش جن خصلتوں کو
نہیں کرتے اجلاف جن حرکتوں کو
وہ یاں اہلِ دولت کو ہیں شیرِ مادر
نہ خوفِ خدا ہے نہ شرمِ پیمبر
کمر بستہ ہیں لوگ خدمت میں اُن کی

گل و لالہ رہتے ہیں صحبت میں اُن کی
نفاست بھری ہے طبیعت میں اُن کی
نزاکت سو داخل ہے عادت میں اُنکی
دواؤں میں مُشک اُنکی اٹھتا ہے ڈھیریں
وہ پوشاک میں عطر ملتے ہیں سیروں

جاگیری نظام کے انحطاط کے ساتھ پرانے علوم کی شمعیں جس طرح بے نور ہوئیں، قدیم تعلیمی ادارے اور فکر و دانش کے مراکز جس طرح ویران ہوئے اور پوری مروجہ تعلیم جس طرح ناکارکردگی کا شکار ہو کر رہ گئی، اور پھر جدید سائنسی فکر، جدید علوم، جدید تعلیم و تعلم، اور جدید ذہنی و تہذیبی سرگرمیوں کی روشنی میں یہ تمام فرسودہ عناصر جس حد تک عبرت انگیز یا مضحکہ خیز نظر آنے لگے، اس کا حقیقت افروز شاعرانہ بیان مسدس کا ایک اہم حصہ ہے۔ یہاں صرف چند بند پیش کئے جا سکتے ہیں:۔

پڑی ہیں سب اُجڑی ہوئی خانقاہیں
وہ درویش و سلطاں کی اب گاہیں
کھُلی تھیں جہاں علم باطن کی راہیں

فرشتوں کی پڑتی تھیں جن پر نگاہیں
کہاں ہیں وہ جذبِ الٰہی کے پھندے
کہاں ہیں وہ اللہ کے پاک بندے
وہ علمِ شریعت کے ماہر کدھر ہیں
وہ اخبارِ دیں کے مبصّر کدھر ہیں
اصولی کدھر ہیں مناظر کدھر ہیں
محدّث کہاں ہیں، مفسّر کدھر ہیں
وہ مجلس جو کل سر بسر تھی چراغاں
چراغ اب کہیں ٹمٹماتا نہیں واں
مدارس وہ تعلیم دیں کے کہاں ہیں
مراحل وہ علم و یقیں کے کہاں ہیں
وہ ارکان شرعِ متیں کے کہاں ہیں
وہ وارث رسولِ امیں کے کہاں ہیں
رہا کوئی امت کا ملجا نہ ماوٰے
نہ قاضی نہ مفتی نہ صوفی نہ ملّا
کہاں ہیں وہ دینی کتابوں کے دفتر
کہاں ہیں وہ علمِ الٰہی کے منظر

چلی ایسی اِس بزم میں بادِ صرصر
بجھیں مشعلیں نورِ حق کی سراسر
رہا کوئی ساماں نہ مجلس میں باقی
صراحی نہ طنبور، مطرب نہ ساقی
بہت لوگ بنکر ہوا خواہِ امت
سفیہوں سے منوا کے اپنی فضیلت
سدا گاؤں درگاؤں، نوبت بہ نوبت
پڑے پھرتے ہیں کرتے تحصیل دولت
یہ ٹھیرے ہیں اسلام کے رہنما اب
لقب اُن کا ہے وارثِ انبیا اب
یہ ہیں جادہ پیمائے راہِ طریقت
مقام اِن کا ہے ماورائے شریعت
اِنھیں پر ہے ختم آج کشف و کرامت
اِنھیں کے ہے قبضے میں بندوں کی قسمت
یہی ہیں مراد اور یہی ہیں مرید اب
یہی ہیں جنید اور یہی بایزید اب
اِس نئے ماحول میں پرانی تعلیم کا جو حشر ہوا اُس کو

حالی نے پورے طور پر بھانپ لیا تھا۔ فرسودہ علوم کی فرسودہ تعلیم جس کھوکھلے پن کی غماز تھی اُس کا اتنا واضح احساس آج بھی کچھ بہت عام نہیں ہے۔ اُس زمانے میں تو یہ چیز قریب قریب عنقا تھی۔ وجہ یہ کہ اِس کا شمار اُن تبدیلیوں میں تھا جو سطح سے بہت نیچے تہذیبی زندگی کی تہوں میں رونما ہوتی ہیں۔ اِس تہ نشین تغیر کا کامیاب ادراک حالی کی تہ بینی اور ژرف نگاہی کا بیّن ثبوت ہے۔ یہ بند ملاحظہ ہوں:۔

وہ جب کر چکے ختم تحصیل حکمت
بندھی سر پہ دستارِ علم و فضیلت
اگر رکھتے ہیں کچھ طبیعت میں جودت
تو ہے سب سے اُن کی بڑی یہ لیاقت
کہ گر دِن کو وہ رات کہہ دیں زبان سے
تو منوا کے چھوڑیں اُسے اک جہاں سے
نہ سرکار میں کام پانے کے قابل
نہ دربار میں لب ہلانے کے قابل
نہ جنگل میں ریوڑ چرانے کے قابل
نہ بازار میں بوجھ اٹھانے کے قابل

نہ پڑھتے تو سو طرح کھاتے کمار
وہ کھوئے گئے اور تعلیم پا کر

جو پوچھو کہ حضرت نے جو کچھ پڑھا ہے
مُراد آپ کی اُس کے پڑھنے سے کیا ہے

مفاد اُس میں دُنیا کا یا دین کا ہے
نتیجہ کوئی یا کہ اس کے سوا ہے

تو مجذوب کی طرح سب کچھ بکیں گے
جواب اس کا لیکن نہ کچھ دے سکیں گے

ان اشعار سے ضمناً یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ حالی کے نزدیک تعلیم کا مقصد سماجی اور اقتصادی کارکردگی تھا۔ مقاصدِ تعلیم کے جدید ترین نظریات کی روشنی میں اِس کو دیکھا جائے۔ تو حالی کی دوررس نظر کا اندازہ کر کے حیرت ہوتی ہے۔

مسدس کے کچھ بند وہ ہیں جن میں بظاہر انگریزی عمل داری کی برکتوں یا برطانوی حکومت کے فضائل کا ذکر ہے۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہ دراصل نئے مشینی اور صنعتی دور کی ترقیوں کا ذکر ہے جو مصنف کے سیاسی

سماجی احساس کی بیداری پر دال ہے۔ ملاحظہ ہو:-

کھلی ہیں سفر اور تجارت کی راہیں!
نہیں بند صنعت کی حرفت کی راہیں
جو روشن ہیں تحصیلِ حکمت کی راہیں
تو ہموار ہیں کسبِ دولت کی راہیں
نہ گھر میں غنیم اور دشمن کا کھٹکا
نہ باہر ہے قزاق و رہزن کا کھٹکا
مہینوں کے کٹتے ہیں رستے پلوں میں
گھروں سے سوا چین ہے منزلوں میں
ہر اک گوشہ گلزار ہے جنگلوں میں
شب و روز ہے امنی قافلوں میں
سفر جو کبھی تھا نمونہ سقر کا
وسیلہ ہے وہ اب سراسر ظفر کا
پہنچتی ہیں ملکوں سے دم دم کی خبریں
چلی آتی ہیں شادی و غم کی خبریں
عیاں ہیں ہر اک بر اعظم کی خبریں
کھلی ہیں زمانے پہ عالم کی خبریں

نہیں واقعہ کوئی پنہاں کہیں کا
ہے آئینہ احوال روئے زمیں کا

پھر مسدس کے وہ اشعار بھی غور طلب ہیں جن میں حالی نے علم کی فضیلت اور عظمت پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ بھی درحقیقت نئے دور کے سائنسی کارناموں کا اعلان ہے۔ حالی نے جدید تہذیب کے اِن ترقی پرور پہلوؤں کو صاف و صریح الفاظ میں سراہا ہے۔ وہو ہذا:-

ہمیشہ سے جو کہتے آئے ہیں سب یاں
کہ ہے علم سرمایۂ فخرِ انساں
عرب اور عجم ہند اور مصر و یوناں
رہا اتفاق اِس پہ قوموں کا یکساں
یہ دعویٰ تھا اک جس پہ حجت نہ تھی کچھ
کھلی اُس پہ ابتک شہادت نہ تھی کچھ
جواہر تھا اِک سب کی نظروں میں بھاری
پرکھنے کی جس کے نہ آئی تھی باری
فضائل تھے سب علم کے اعتباری
نہ تھیں طاقتیں اُس کی معلوم ساری

یہ اب بحر و بر دے رہے ہیں گواہی
کہ ہے علم میں زورِ دستِ الٰہی
کیا کوہساروں کو مسمار اِس نے
بنایا سمندر کو بازار اِس نے
زمینوں کو منوایا دوّار اِس نے
ثوابت کو ٹھہرایا سیّار اِس نے
لیا بھاپ سے کام لشکر کشی کا
دیا پتلیوں کو سکت آدمی کا
یہ پتھر کا ایندھن ہے جلوانے والا
جہازوں کو خشکی میں چلوانے والا
صداؤں کو سانچے میں ڈھلوانے والا
زمیں کے خزانے اُگلوانے والا
یہی برق کو نامہ بر ہے بناتا
یہی آدمی کو ہے بے پر اُڑاتا
تمدّن کے ایوان کا معمار ہے یہ
ترقی کے لشکر کا سالار ہے یہ
کہیں دستکاروں کا اوزار ہے یہ

کہیں جنگجویوں کا ہتھیار ہے یہ
دکھایا ہے نیچا دلیروں کو اس نے
بنایا ہے روباہ شیروں کو اس نے

اور پھر کچھ مسدس ہی پر موقوف نہیں۔ زندگی، انسان، سماج اور تہذیب کے بارے میں حالی کا ترقی پسندانہ رویّہ اُن کی ہر نوع کی تخلیقات میں یکساں وضاحت کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ غزل ہو یا قصیدہ، رباعی ہو یا قطعہ، ادبی مضمون ہو یا علمی مقالہ، اُن کا بیدار اجتماعی شعور ہر جگہ اپنی پوری قوت کے ساتھ کارفرما ہے۔ زمانے کی تاریخی تبدیلیوں اور اُن تبدیلیوں کے مطالبات سے وہ کہیں اور کسی حال میں غافل نہیں ہوتے۔ زیادہ مثالوں کی گنجائش نہیں۔ نمونے کے طور پر صرف ایک پارۂ نثر پیش کیا جاتا ہے جو اُن کے مضمون زمانہ سے ماخوذ ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

"اے ہندوستان کے مسلمانو! کیا تم ابھی اُسی عالم میں ہو جس میں تمہارے آباء اجداد زندگی بسر کر گئے ہیں؟ اور کیا تم اُسی کھیتی کے پروان چڑھنے کے منتظر ہو جس میں تمہارے بزرگوں نے تخم افشانی

کی تھی؟ مدت ہوئی کہ وہ عالم گزر گیا اور وہ کھیتی دریا برد ہو گئی۔ ذرا آنکھیں کھولو اور دیکھو کہ تم کون ہو۔ اور کہاں ہو۔ تمہاری گرہ میں جو دام ہیں وہ بازار میں آج پھوٹی کوڑی کو نہیں چلتے۔ تمہاری دوکان میں جو مال ہے اُسے کوئی مفت بھی نہیں لینا چاہتا۔ تمہارے چراغ میں جو تیل تھا وہ جل لیا اور تمہاری کھیتی میں جو پانی تھا وہ سوکھ گیا۔ دیکھو تمہاری ناؤ بودی ہے اور دریا دم بدم چڑھتا جاتا ہے۔ تمہارا قافلہ پیادہ ہے اور منزلیں کٹھن آتی جاتی ہیں۔"

حالی کے اِس ترقی پسندانہ شعور کا اظہار جس طرح اُن کی شاعری اور انشائیہ نگاری میں ہوا اُسی طرح اُن کے تنقیدی نظریات اور تنقیدی خیالات میں بھی ہوا۔ مقدمہ شعر و شاعری میں انھوں نے شعر و شاعری کے متعلق جو نظریے قائم کئے ہیں، شعر کی حقیقت و ماہیت پر جس طرح روشنی ڈالی ہے، اور اردو شاعری کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ ساری تنقید ـــــ نظریاتی

اور عملی ——— اُن کے ترقی پسندانہ شعور کی آئینہ دار ہے۔ مقدمہ کا کوئی حصّہ ایسا نہیں ہے جس پر اُن کے ترقی پسندانہ نظریۂ حیات کی چھاپ نظر نہ آتی ہو!

یہ دیکھنے سے پہلے کہ حالی کا عام اجتماعی شعور اُن کے تنقیدی افکار پر کس طور سے اور کس حد تک اثر انداز ہوا ہے، یہ ضروری ہے کہ شعر و شاعری کے بارے میں اُن کے ایک منفیانہ رجحان کا جائزہ لیا جائے۔

حالی اپنے زمانے کی مروجہ اردو شاعری سے نہ صرف غیر مطمئن بلکہ بیزار اور متنفر تھے۔ اِس بیزاری اور تنفر کا اظہار مدوجزرِ اسلام کے دیباچے میں وہ اِس طرح کر چکے تھے:۔

"..... شاعری کی بدولت چند روز جھوٹا عاشق بننا پڑا۔ ایک خیالی معشوق کی چاہ میں برسوں وحشتِ جنوں کی وہ خاک اُڑائی کہ قیس و فرہاد کو گرد کر دیا۔ کبھی نالۂ نیم شبی سے رہِ مسکوں کو ہلا ڈالا، کبھی چشمِ دریا بار سے تمام عالم کو ڈبو دیا۔ آہ و فغاں کے شور سے کروبیان کے کان بہرے ہو گئے۔ شکایتوں کی

بوچھاڑ سے زمانہ چیخ اٹھا۔ طعنوں کی بھرمار سے آسمان چھلنی ہوگیا۔ جب رشک کا تلاطم ہوا تو ساری خدائی کو رقیب سمجھا۔ یہاں تک کہ آپ اپنے سے بدگمان ہوگئے۔ جب شوق کا دریا امڈا تو کشش دل سے جذبِ مقناطیسی اور قوت کہربائی کا کام لیا۔ بارہا تیغ ابرو سے شہید ہوئے اور بارہا ایک ٹھوکر سے جی اُٹھے۔ گویا زندگی ایک پیراہن تھا کہ جب چاہا اتار دیا اور جب چاہا پہن لیا۔ میدان قیامت میں اکثر گزر ہوا۔ بہشت و دوزخ کی اکثر سیر کی۔ بادہ نوشی پر آئے تو خم کے خم لنڈھا دئے اور پھر بھی سیر نہ ہوئے۔ کبھی خانۂ خمار کی چوکھٹ پر جبہ سائی کی اور کبھی مے فروش کے در پر گدائی کی۔ کفر سے مانوس رہے، ایمان سے بیزار رہے، پیرِ مغاں کے ہاتھ پر بیعت کی۔ برہمنوں کے چیلے بنے، بُت پوجے، زنّار باندھا، قشقہ لگا۔ زاہدوں پر پھبتیاں کہیں، واعظوں کا خاکہ اُڑایا، دیر اور بت خانے کی تعظیم کی، کعبے اور مسجد کی توہین کی۔ خدا سے شوخیاں کیں، نبیوں سے گستاخیاں کیں، اعجازِ مسیحی کو

ایک کھیل جانا حسنِ یوسفی کو ایک تماشا سمجھا۔ غزل کہی تو پاک شہیدوں کی بولیاں بولیں، قصیدہ لکھا تو بھاٹ اور بادخوانوں کے منہ پھیر دئے۔ ہر مشتِ خاک میں اکسیرِ اعظم کے خواص بتلائے۔ ہر چوبِ خشک میں عصائے موسوی کے کرشمے دکھائے۔ ہر نمرودِ وقت کو ابراہیم خلیل سے جا ملایا۔ ہر فرعونِ بے ساماں کو قادرِ مطلق سے جا بھڑایا۔ جس کے مداح بنے اُسے ایسا بانس پر چڑھایا کہ خود ممدوح کو اپنی تعریف میں کچھ مزہ نہ آیا۔ غرض نامۂ اعمال ایسا سیاہ کیا کہ کہیں سفیدی باقی نہ چھوڑی۔"

اِسی دیباچے میں آگے چل کر حالی نے لکھا تھا:۔

"زمانے کا نیا ٹھاٹھ دیکھ کر پرانی شاعری سے جی سیر ہو گیا تھا اور جھوٹے ڈھکوسلے باندھنے سے شرم آنے لگی تھی۔"

خود مسدس میں اردو کی مروجہ شاعری پر اِس طرح اظہارِ خیال کیا تھا:۔

وہ شعر اور قصائد کا ناپاک دفتر

عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بدتر

زمیں جس سے ہے زلزلے میں برابر
مُلک جس سے شرماتے ہیں آسماں پر
ہوا علم و دیں جس سے تاراج سارا
وہ ہے ہف نظر علم انشا ہمارا
بُرا شعر کہنے کی گر کچھ سزا ہے
عبث جھوٹ بکنا اگر ناروا ہے
تو وہ محکمہ جس کا قاضی خدا ہے
مقرر جہاں نیک و بد کی سزا ہے
گنہگار واں چھوٹ جائیں گے سارے
جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے
زمانے میں جتنے قلی اور نفر ہیں
کمائی سے اپنی وہ سب بہرہ ور ہیں
گویّے امیروں کے نورِ نظر ہیں
ڈفالی بھی لے آتے کچھ مانگ کر ہیں
مگر اِس تپ دق میں جو مبتلا ہیں
خدا جانے وہ کس مرض کی دوا ہیں

جو سقّے نہ ہوں جی سے جائیں گزر سب
ہو میلا جہاں گم ہوں دھوبی اگر سب
بنے دم پہ گر شہر چھوڑیں نفر سب
جو ٹھڑ جائیں مہتر تو گندے ہوں گھر سب
پہ کر جائیں ہجرت جو شاعر ہمارے
کہیں مل کے خس کم جہاں پاک سارے

مروجہ شاعری سے بیزاری یا نفرت کا یہی برتاؤ مقدمہ میں بھی نظر آتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں :۔

"وزن اور قافیہ جن پر ہماری موجودہ شاعری کا دارومدار ہے اور جن کے بغیر اُس میں کوئی خصوصیت ایسی نہیں پائی جاتی جسکے سبب سے شعر پر شعر کا اطلاق کیا جا سکے، یہ دونوں شعر کی ماہیت سے خارج ہیں"

پھر ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں :۔

اردو شاعری کی ترقی کا خیال پکا ناگویا زمانہ ناسازگار سے مقابلہ کرنا ہے ..... لیکن چونکہ یاس اور امید دونوں حالتوں میں اخیر وقت تک ہاتھ پاؤں مارنا جان دار کا طبعی اقتضا ہے ...

..... اس لئے جو کچھ ہم لکھنا چاہتے ہیں اُس سے یہ جتانا مقصود نہیں ہے کہ کچھ ہو گا بلکہ یہ ظاہر کرنا ہے کہ کاش ایسا ہوتا۔"

اور مقدمہ کے آخر میں اردو شاعری کی طرف سے پھر اپنی مایوسی کا اظہار اِس طرح کرتے ہیں:۔

"اب ہم اس مضمون کو ختم کرتے ہیں۔ اِس کی نسبت یہ اُمید رکھنی کہ ہمارے دیرینہ سال شاعر جن پر قدیم شاعری کا رنگ چڑھ گیا ہے۔ اِس مضمون کی طرف التفات کریں گے یا اِس کو قابلِ التفات سمجھیں گے محض بے جا ہے۔"

حالی اردو شاعری سے اس حد تک غیر مطمئن تھے یا یوں کہئے کہ اردو شاعری کے معائب و نقائص کو وہ اِس شدت کے ساتھ محسوس کرتے تھے کہ مطلق شعر و شاعری کی طرف سے بھی بد دل ہو گئے تھے۔ مقدمہ کے بالکل آغاز میں لکھتے ہیں:۔

"شعر کی مدح و ذم میں بہت کچھ کہا گیا ہے، اور جس قدر اُس کی مذمت کی گئی ہے وہ

بہ نسبت مدح کے زیادہ قرینِ قیاس ہے۔"

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

"جب تک شاعر کی فکر میں اتنی بھی اپج نہ ہو جتنی کہ ایک بیے میں گھونسلا بنانے کی اور مکڑی میں جالا پورنے کی ہوتی ہے اُس کو ہرگز مناسب نہیں کہ اِس خیالِ خام میں اپنا وقت ضائع کرے بلکہ خدا کا شکر کرنا چاہیے کہ اُس کے دماغ میں یہ خلل نہیں ہے۔"

اور الفاظ کی بحث میں ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"شاید نثر میں بعض الفاظ کی ضرورت نہ پڑے لیکن شعر میں اِن کی ضرورت ہمیشہ رہے گی۔ (اگرچہ اِس میں کلام ہے کہ شعر کی بھی ضرورت رہے گی یا نہیں)۔"

حالی نے مقدمہ کے علاوہ اپنے دیوان پر ایک مختصر دیباچہ بھی لکھا تھا۔ مقدمہ میں مطلق شعر و شاعری پر بحث تھی اور اردو کی اصنافِ نظم کا جائزہ۔ دیباچے میں اُن باتوں کا ذکر تھا جو خاص طور پر دیوان سے متعلق تھیں۔ شاعری

کی طرف سے مایوسی اور بددلی کا اظہار اس دیباچے میں بھی پایا جاتا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"..... شاعرانہ مذاق یوماً فیوماً ملک سے مفقود ہوتا جاتا ہے۔ اور ایسی علامتیں موجود ہیں جن سے پایا جاتا ہے کہ ہماری شاعری کا چراغ بہت جلد ہمیشہ کے لئے گل ہونے والا ہے۔ نہ پرانی شاعری باقی رہتی نظر آتی ہے اور نہ نئی شاعری آگے چلتی معلوم ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں دیوان شائع ہونا اور شاعری کے متعلق کچھ اصول بیان کرنے ایسی بات تھی جیسی چین میں عبرانی بائبل شائع کرنی....."

ظاہر ہے کہ اردو شاعری یا مطلق شعر و شاعری سے نفرت کرنا کوئی ترقی پسندی نہیں ہے۔ لیکن حالی کا یہ منفی رجحان دراصل کوئی مستقل عقیدہ یا نظریہ نہیں ہے، بلکہ محض ایک عارضی موڈ اور ایک ضمنی کیفیت ہے۔ اگر ہم اس کو ایک وقتی پوز سمجھکر نظر انداز کریں تو شاید نامناسب نہ ہوگا۔ پھر شاید اس کی توجیہیں بھی کی جا سکتی ہے کہ اردو شاعری کے وہ اوصاف جو ایک گزرے ہوئے سماجی و تمدنی

ماحول کی پیداوار تھے بدلے ہوئے حالات یا تبدیل شدہ ماحول میں اُن کو مہمل یا مضحکہ خیز معلوم ہوتے تھے۔ اور اسی باعث وہ کبھی اُن کے خلاف نفرت و بیزاری کا اظہار کرتے ہیں، کبھی اُن کو طنز و تضحیک کا نشانہ بناتے ہیں، اور کبھی مطلق شعر و شاعری پر وار کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔

یہ تو تھا حالی کا ایک عام اور سرسری اندازِ نظر اور اُس کی توجہ۔ لیکن دراصل لائقِ مطالعہ اور غور طلب بات یہ ہے کہ مقدمہ کے مختلف مباحث و مطالب میں حالی کے ترقی پسندانہ شعور کا اظہار کس طرح سے ہوا ہے۔

○

حالی "ادب برائے ادب" کے قائل نہیں۔ وہ مقصدی ادب کے علم بردار ہیں اور شعر و شاعری کا ایک افادی تصوّر رکھتے ہیں۔ چنانچہ مقدمہ شعر و شاعری کی سب سے پہلی بحث شعر کی افادیت یا شعر و شاعری کے فوائد سے تعلق رکھتی ہے۔ حالی دلائل کے ذریعے اور مثالوں کی مدد سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ شاعری کا ملکہ بیکار نہیں ہے اور اُس سے بڑے بڑے کام لئے گئے ہیں۔ ذیل کے

اقتباسات ملاحظہ ہوں :۔

"..... ایک بانسری بجانے والا جو کسی سنسان ٹیکرے پر تنِ تنہا بیٹھا بانسری کی لَے سے اپنا دل بہلاتا اور شاید کبھی کبھی سننے والوں کے دل بھی اپنی طرف کھینچتا ہے، گو اُس کی ذات سے بنی نوع کے فائدے کی چنداں توقع نہیں، مگر وہ اپنے دل چسپ مشغلے کو کسان اور معمار کے کام سے کچھ کم ضروری نہیں سمجھتا، اور اِس خیال سے اپنے دل میں خوش ہے کہ اگر اِس کام کو سلسلۂ تمدن میں کچھ دخل نہ ہوتا تو صانعِ حکیم انسان کی طبیعت میں اِس کا مذاق ہرگز پیدا نہ کرتا۔"

"..... ایک ایسے عطیے کو جو قدرت نے عنایت کیا ہو صرف اِس وجہ سے کہ اکثر لوگ اُس کو فطرت کے خلاف استعمال کرتے ہیں کسی طرح عبث اور بیکار نہیں کہا جا سکتا ....."

"ہمارے ملک میں بھانڈ اور نقالوں کا کام بہت ذلیل سمجھا جاتا ہے ..... لیکن یورپ میں

اِسی سوانگ اور نقالی نے اصلاح پاکر قوموں کو بے انتہا اخلاقی اور تمدنی فائدے پہنچائے ہیں"

"باجے کے تمام آلات جو ہمارے یہاں ہمیشہ لہو و لعب کے مجمعوں میں مستعمل ہوتے ہیں اور جن کو یہاں کے عقلا محض فضول جانتے ہیں، شائستہ قوموں نے اُن کے مناسب استعمال سے نہایت گراں بہا فائدے اٹھائے ہیں ...."

"یورپ میں پولیٹیکل مشکلات کے وقت قدیم سے پوئٹری کو قوم کی ترغیب و تحریص کا ایک زبردست آلہ سمجھتے رہے ہیں ...."

پھر دنیائے شعر و ادب کی تاریخ سے چند واقعات حالی نے مثال کے طور پر پیش کئے ہیں اور یہ بتایا ہے کہ سولن بائرن، اعشیٰ، رودکی اور دوسرے شعرا کے کلام نے مختلف اوقات پر اپنے زمانے کی خارجی زندگی کو کس کس طرح متاثر کیا۔

اِس ساری بحث کی اہمیت یہ ہے کہ اردو ادب کی تاریخ میں شعر کے افادی تصور پر یہ پہلی بحث ہے۔

ہمارے یہاں سب سے پہلے حالی ہی نے شعر و ادب کو مقصدیت کے معیار سے جانچا اور افادیت کی میزان میں تولا۔

○

مقدمہ کی دوسری اہم بحث شاعری اور ماحول کے باہمی تعلق کے بارے میں ہے۔ حالی ادب اور زندگی کے تعلق کو نہایت واضح طور پر محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ وہ شاعری کو سماجی زندگی کا تابع اور مادی و خارجی ماحول کا پابند خیال کرتے ہیں۔ انھوں نے سماجی زندگی یا خارجی ماحول کے لئے ہر جگہ سوسائٹی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"قاعدہ ہے کہ جس قدر سوسائٹی کے خیالات اُس کی رائیں، اُس کی عادتیں، اُس کی رغبتیں، اُس کا میلان اور مذاق بدلتا ہے اُسی قدر شعر کی حالت بدلتی رہتی ہے۔ اور یہ تبدیلی بالکل بے معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ سوسائٹی کی حالت کو دیکھکر شاعر قصداً اپنا رنگ نہیں بدلتا، بلکہ سوسائٹی کے ساتھ ساتھ وہ خود بخود بدلتا چلا جاتا ہے۔"

گویا حالی آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے جدید ادبی تنقید کے اِس بنیادی نظریے سے پورے طور پر واقف تھے کہ خارجی مادی حقیقت جو زندگی فطرت اور سماج کا آمیزہ ہے انسان کے تخیلی تجربات اور جمالیاتی احساسات کا اصلی سرچشمہ ہے۔ اسی بنا پر تخلیقی فن ایک سماجی عمل اور ادب ایک سماجی پیداوار قرار پاتا ہے۔ فرد جس دنیا میں جنم لیتا ہے اور پروان چڑھتا ہے وہ دراصل ایک دوہری دنیا ہے، معاشرتی دنیا اور طبعی دنیا ——— عالمِ اشخاص اور عالمِ اشیا۔ یہ دوہری دنیا، یہ دوہرا عالم، یہ معاشرتی اور طبعی ماحول کوئی جامد اساس، متحجر چیز نہیں۔ بلکہ ایک تغیر پذیر، حرکت آشنا حقیقت ہے۔ ادب اِس کا عکاس، مفسر اور ترجمان ہے۔ اِسی کے ہاتھوں تشکیل پاتا ہے اور اِسی مصدرِ فکر و ذوق سے فیضان حاصل کرتا ہے۔ مزید برآں حالی اِس امر سے بخوبی واقف تھے کہ ادب زندگی سے متاثر ہی نہیں ہوتا، بلکہ اُس کو متاثر بھی کرتا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:۔

"اگرچہ شاعری کو ابتداءً سوسائٹی کا مذاقِ فاسد بگاڑتا ہے، مگر شاعری جب بگڑ جاتی ہے تو

اُس کی زہریلی ہوا سوسائٹی کو بھی نہایت سخت نقصان پہنچاتی ہے۔"

اِس سلسلے میں حالی نے شاعری اور دربار کے تعلق کو بہت عمدگی کے ساتھ واضح کیا ہے، اور شخصی حکومتوں اور خود مختار سلطنتوں کے دور میں شاعری جس طرح بتدریج زوال کا شکار ہوتی ہے اُس کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ اِس ساری گفتگو میں یہ خیال شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر مصنف کے ذہن میں برابر رہا ہے کہ شاعری زندگی سے علیحدہ کوئی چیز نہیں ہے، اور جب زندگی سے اُس کا رشتہ منقطع ہو جاتا ہے تو یہ محض ایک رسمی و تقلید تک بندی ہو کر رہ جاتی ہے۔ جہاں تک ادب کے نامیاتی اور حرکی تصور کا تعلق ہے، حالی یقیناً بیسویں صدی کے عمرانی نقادوں کے پیش رو تھے!

○

شعر میں کیا کیا خوبیاں ہونی چاہئیں؟ —— مقدمہ کی ایک اہم بحث ہے، جس کے خاتمے پر حالی لکھتے ہیں:-

"رہا وہ کلام جس میں نہ سادگی، نہ جوش، نہ اصلیت، تینوں چیزیں نہ پائی جائیں، سو ایسے کلام سے

ہمارے شعرا کے دیوان بھرے پڑے ہیں، کیونکہ ہماری شاعری زیادہ تر اب دو قسم کے مضامین پر منحصر ہے۔ عشقیہ یا مدحیہ۔ عشقیہ مضامین اکثر غزل، مثنوی اور قصائد کی تشبیب میں باندھے جاتے ہیں۔ اور مدحیہ مضامین زیادہ تر قصائد میں۔ سو اِن تینوں صنفوں میں شاعر کا کام یہ سمجھا جاتا ہے کہ جو مضامین قدیم سے بندھتے چلے آئے ہیں اور جو بندھتے بندھتے بمنزلہ اصولِ مسلّمہ کے ہو گئے ہیں، اُنھیں کو ہمیشہ یہ ادنیٰ تغیر باندھتا رہے اور اُن سے سرمو تجاوز نہ کرے۔"

اِس کے بعد حالی نے غزل، مثنوی اور قصیدے کے روایتی مضامین کا استقرا کیا ہے اور کچھ آگے چل کر نیچرل شاعری کی بحث میں پھر غزل کے روایتی علائم اور استعارات اور کنایات کا جائزہ لیا ہے۔ رسمی شاعری کے اِن فرسودہ عناصر کو جس طرح حالی نے واضح کیا ہے وہ اُن کی ترقی پسندانہ نظر کا ثبوت ہے۔ انھوں نے نہایت صفائی کے ساتھ اردو غزل کی اُن تمام علامتوں پر انگلی رکھ دی ہے

جو اپنا سماجی مفہوم اور سماجی قدر و قیمت کھو چکی ہیں، اور اب جن کی حیثیت بے جان الفاظ سے زیادہ نہیں ہے۔

"زبان کو درستی کے ساتھ استعمال کرنا"۔ مقدمۂ شعر و شاعری کی ایک اور اہم بحث ہے۔ زبان اور زبان کے استعمال کا جہاں تک تعلق ہے حالی اپنی دور رس بصیرت اور ترقی پسندانہ شعور کی بنا پر اپنے زمانے سے کم از کم نصف صدی آگے تھے۔ اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:۔

"جو لوگ اپنے تئیں زبان کا مالک سمجھتے ہیں یعنی اہل دہلی یا اہل لکھنؤ، اُن کو اس بات پر فخر کرنا نہیں چاہیے کہ ہماری زبان کا لوگ اتباع کرتے ہیں۔ اور ہمارے روزمرہ کی پیروی کی جاتی ہے۔ اُن کو یاد رکھنا چاہیے کہ اگر وہ اپنی زبان کی خبر نہ لیں گے، اُس کے محفوظ رکھنے کے وسائل بہم نہ پہنچائیں گے، اُس کے الفاظ و محاورات کو نہایت احتیاط کے ساتھ فراہم اور مرتب نہ کریں گے، اور اُس کی نظم و نثر کو زمانے کے مذاق کے موافق ترقی نہ دیں گے تو اُن کی زبان کا

وہ حصہ جس پر اُن کو فخر ہے اور جو اُن کی اور تمام ہندوستان کی اردو میں مابہ الامتیاز ہے، حرفِ غلط کی طرح صفحۂ روزگار سے محو ہو جائے گا اور یہی بُری بھلی اردو جو عام اخبارات اور جدید تصنیفات کے ذریعے سے ملک میں پھیل رہی ہے اور جس کو وہ اب تک حقارت کی نظر سے دیکھتے رہے ہیں زیادہ سے زیادہ نصف صدی میں ملک کی ٹکسالی اور فصیح زبان قرار پا جائے گی۔"

زبان کے معاملے میں حالی کی نظر کتنی دور رس تھی۔ اُن کے اِس بیان سے ظاہر ہوتا ہے:۔

"اردو پر قدرت حاصل کرنے کے لئے صرف دہلی یا لکھنؤ کی زبان کا تتبع ہی کافی نہیں ہے۔ بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ عربی اور فارسی میں کم سے کم متوسط درجے کی لیاقت، اور نیز ہندی بھاشا میں فی الجملہ دستگاہ بہم پہنچائی جائے..... اردو زبان کا شاعر جو ہندی بھاشا کو مطلق نہیں جانتا اور محض عربی و فارسی کے تان گاڑھی چلاتا ہے وہ گویا

اپنی گاڑی بغیر پہیوں کے منزل مقصود تک پہنچانی
چاہتا ہے۔ اور جو عربی و فارسی سے نابلد ہے اور
صرف ہندی بھاشا یا محض مادری زبان کے بھروسے
پر اس بوجھ کا متحمل ہوتا ہے وہ ایک ایسی گاڑی
ٹھیلتا ہے جس میں بیل نہیں جوتے گئے۔"

الفاظ کی صحت یا عدم صحت کے بارے میں بھی حالی اپنے زمانے کی محدود خیالی، تنگیِ نظر اور غیر سائنٹفک روش سے ہٹ کر ایک ایسے مسلک کے پیرو تھے جو اصول لسانیات سے ہم آہنگ ہونے کی بنا پر ایک سائنٹفک، رواداریانہ اور ترقی پسندانہ مسلک تھا، اور جو خود اُن کے الفاظ میں یہ ہے:۔

"ایسے لفظوں کو جو عربی یا فارسی یا انگریزی
سے اردو میں لئے گئے ہیں اور اصل وضع کے خلاف
عموماً مستعمل ہوتے ہیں، یہ سمجھنا ہی غلطی ہے کہ وہ
موجودہ صورت میں عربی یا فارسی یا انگریزی کے
الفاظ ہیں، نہیں، بلکہ اُن کو اردو کے الفاظ سمجھنا چاہئے
جو اصل کے لحاظ سے عربی یا فارسی یا انگریزی سے
ماخوذ ہیں۔"

حالی سے تقریباً ستّو برس پہلے انشا اپنی معرکتہ الآرا تصنیف دریائے لطافت میں اِس اہم اصول کو ان الفاظ میں پیش کر چکے تھے:۔

"ہر لفظ جو اردو میں مشہور ہو گیا، عربی ہو یا فارسی، ترکی ہو یا سریانی، پنجابی ہو یا پوربی، از روئے اصل غلط ہو یا صحیح، وہ لفظ اردو کا لفظ ہے۔ اگر اصل کے موافق مستعمل ہے تو بھی صحیح ہے اور اگر خلافِ اصل مستعمل ہے تو بھی صحیح ہے۔ اس کی صحت و غلطی اردو کے استعمال پر موقوف ہے۔ کیونکہ جو کچھ خلافِ اردو ہے غلط ہے گو اصل میں وہ صحیح ہو، اور جو کچھ موافقِ اردو ہے صحیح ہے، گو اصل میں صحت نہ رکھتا ہو۔"

ظاہر ہے کہ اِس اصول یا مسلک کا جہاں تک تعلق ہے انشا حالی کے پیش رو ہیں۔ لیکن حالی کے زمانے تک زبان کی نام نہاد اصلاح کی تحریک کچھ اِس طرح اپنے قدم جما چکی تھی اور الفاظ کی صحت و فصاحت کے مصنوعی اصول اِس حد تک ذہنوں پر قابض ہو چکے تھے کہ انشا کے

وضع کردہ اصول کی طرف بھول کر بھی کسی کا دھیان نہیں جاتا تھا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ انشا کا وضع کردہ یہ اصول دریائے لطافت کے اوراق ہی میں ہمیشہ دفن رہا، اور ان اہم اور یادگار الفاظ کی طرف کبھی کسی نے توجہ کی ہی نہیں۔ حالی نے اس اصول کا اعادہ کر کے نہ صرف اپنی سلامتِ طبع کا ثبوت دیا بلکہ ایک ایسے مسلک کی اہمیت بھی دوبارہ جتائی جو نہایت اہم ہوتے ہوئے بھی عام نظروں سے اوجھل تھا۔ حالی کی اس بروقت تنبیہ نے بیسویں صدی کی اردو نثر کو جس طرح متاثر کیا اس کا اندازہ لگانا کچھ مشکل کام نہیں۔

○

غزل کی اصلاح کے سلسلے میں جو مشورے حالی نے پیش کئے ہیں وہ ایک عقلیت پسندانہ دماغ کی پیداوار ہیں اور یہ پوری بحث حالی کی ترقی پسند تنقید کا بہت اچھا نمونہ ہے۔ حالی کی ساری کوشش یہ ہے کہ اردو غزل کو ایسے عناصر کی گرفت سے آزاد کیا جائے جو محض رواجی اور رسمی ہیں، اور اس میں موضوعات کے لحاظ سے ایسی تبدیلیاں پیدا کی جائیں جن کی بنا پر وہ واقعیت، اصلیت اور سلامت

سے ہم کنار ہو اور دورِ جدید کے ذہنی تقاضوں کو کسی نہ کسی حد تک پورا کر سکے۔ وہ کہتے ہیں:۔

"یہ صحیح نہیں ہے کہ جو خیالات اگلوں نے زمانے کے اقتضا سے یا اپنے جذبات کے جوش میں ظاہر کئے ہیں ہم بھی وہی راگ گاتے رہیں اور انھیں کے خیالات کا اعادہ کرتے رہیں۔ نہیں بلکہ ہم کو چاہئے کہ اپنی غزل کو خود اپنے خیالات اور اپنے جذبات کا آرگن بنائیں"

غزل کی اصلاح کے سلسلے میں حالی کے مندرجۂ ذیل الفاظ جس طرح ایک شاندار اور پُر شکوہ طرزِ نگارش کی نمائندگی کرتے ہیں اُسی طرح شعر و ادب کے ایک ترقی پسند تصوّر کے ترجمان ہیں:۔

"بے شک اخلاقی مضامین کو مؤثر پیرائے میں بیان کرنا نہایت مشکل کام ہے۔ اور بلاشبہ غزل جس میں سوز و گداز نہ ہو اور بچہ جو چلبلا اور چونچال نہ ہو دونوں میں کچھ کشش اور گیرائی نہیں ہوتی لیکن ہمارے معاصرین کے لئے سوز و گداز کا اس قدر مصالحہ موجود ہے

جو صدیوں تک میسّر نہیں سکتا۔ دنیا میں ایک انقلاب عظیم ہو رہا ہے اور ہوتا چلا جاتا ہے۔ آج کل دنیا کا حال صاف اُس درخت کا سا نظر آتا ہے جس میں برابر نئی کونپلیں پھوٹ رہی ہیں اور پرانی ٹہنیاں جھڑتی چلی جاتی ہیں۔ تناور درخت زمین کی تمام طاقت چوس رہے ہیں، اور چھوٹے چھوٹے تمام پودے جو اُن کے گرد و پیش ہیں سوکھتے چلے جاتے ہیں۔ پرانی قومیں جگہ خالی کرتی جاتی ہیں، اور نئی قومیں اُن کی جگہ لیتی جاتی ہیں۔ اور یہ کوئی گنگا جمنا کی طغیانی نہیں ہے جو آس پاس کے دیہات کو دریا بُرد کر کے رہ جائے گی۔ بلکہ یہ سمندر کی طغیانی ہے جس سے تمام کرۂ زمین پر پانی پھرتا نظر آتا ہے اگر کوئی دیکھے اور سمجھے تو صدہا تماشے صبح سے شام تک ایسے عبرت خیز نظر آتے ہیں کہ شاعر کی تمام عمر اُس کی جزئیات کے بیان کرنے کے لئے کافی نہیں ہو سکتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہر بات کا ایک محل اور ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے۔ عشق و عاشقی کی ترنگیں اقبال مندی کے زمانے میں زیبا تھیں۔ اب وہ وقت

گیا۔ عیش و عشرت کی رات گزر گئی اور صبح نمودار ہوئی۔ اب کالنگڑے اور بہاگ کا وقت نہیں رہا۔ اب جوگیے کی الاپ کا وقت ہے۔"

○

الغرض مقدمۂ شعر و شاعری کے مختلف مباحث اور موضوعات کی چھان بین سے یہی پتا چلتا ہے کہ حالؔی کی تنقیدی فکر اُن کے ترقی پسندانہ تصورِ حیات اور ترقی پرورانہ ادبی شعور کی پورے طور پر آئینہ دار تھی، اور یہ کہ مقدمہ کا کوئی پہلو یا کوئی حصّہ ایسا نہیں ہے جس پر حالؔی کے مجدّدانہ اور درایت پسندانہ طرزِ فکر کی چھاپ نظر نہ آتی ہو۔ اِس حقیقت کے پیشِ نظر یہ نتیجہ نکالنا بالکل قدرتی بات ہو گی کہ حالؔی اردو میں صرف تنقید کے بانی ہی نہیں، بلکہ ترقی پسندانہ تنقیدی فکر کے بانی بھی تھے۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ اردو ادب میں علمی تنقید کی بنیاد رکھی، بلکہ آغازِ کار ہی سے تنقید اور تنقیدی فکر کو ایک نیا اور اہم موڑ بھی دیا۔ اور ایک نئے اور اہم نظریاتی شعور سے بھی آشنا کیا۔ یوں وہ ایک عہد آفریں بصیرت کے ادیب تھے اور ادبی تنقید کی دنیا میں اُن کی آواز ایک عصر

آفریں آواز تھی۔

حالی کی ناقدانہ اہمیت کے اِس بنیادی احساس کے ساتھ دو باتوں کا ذہن میں رکھنا بہت ضروری ہے۔

اول تو یہ کہ حالی اپنی تنقیدی فکر و نظر کے عمرانی میلان، سائنٹفک انداز، بلند دانش ورانہ معیار، وسعت اور گیرائی کی بنا پر اپنے ہم عصر نقادوں سے واضح طور پر ممتاز و افضل نظر آتے ہیں۔ آزاد اور شبلی دونوں کی تنقیدی کاوشیں، اپنے مخصوص محاسن کے باوصف، زبان و اندازِ بیان، الفاظ و محاورات، بندش و ترکیب اور فصاحت و بلاغت کے رسمی مباحث تک محدود ہیں۔ ایک کے یہاں داستاں طرازی ہے، دوسرے کے یہاں روایتی تجزیہ اور مکتبی موشگافی۔ زندگی، سماج اور زمانے سے دونوں کو سروکار نہیں۔ حیات انسانی اور اُس کے ارتقائی عمل سے ادب اور تنقیدِ ادب کو مربوط کرنے کی کوشش دونوں کے یہاں مفقود ہے۔ فن تنقید کی کوئی سائنٹفک بنیاد نہ اُن کے یہاں ملتی ہے نہ ان کے یہاں۔ حالی کی تنقید اور اُس کی ذہنی سطح کو نظر میں رکھ کر دیکھئے تو اُس دور کی بقیہ تنقید بازیچۂ اطفال معلوم ہوتی ہے۔

دوسری بات یہ کہ گو حالی کے بعد اردو تنقید کا دائرہ بہت وسیع ہوا ہے، اور وصفی اعتبار سے نہیں تو مقدار کے لحاظ سے تو یقیناً ہمارا تنقیدی ادب کہیں سے کہیں پہنچ گیا ہے، لیکن اِس سلسلے میں جو کام حالی سے بن پڑا وہ اب تک کسی دوسرے ایک نقاد سے نہیں بن پڑا ہے۔ مطلب یہ کہ مجموعی طور پر تو ہماری تنقید حالی کے زمانے کی تنقید سے بہت آگے ہے۔ مگر حالی کی تنقیدی کارگزاری اپنے وزن اور گراں مایگی کے لحاظ سے آج تک منفرد اور بے مثال ہے۔ مقدمۂ شعر و شاعری اردو تنقید کی خشتِ اول ہونے کے باوجود بعد کے تمام تنقیدی کارناموں پر فائق ہے۔ وہ تنقید کے میدان میں ایک منارۂ نور ہے، بلند، عظیم اور برگزیدہ بھی اور ضوریز و ضیا پاش بھی۔

MASOOD FAISAL JHANDIR LIBRARY
Acc No:
MAILSI
02 FEB 2021
کتابخانہ / محمد ہارون موسیٰ

مقدمہ شعر و شاعری اردو تنقید کا عہدنامہ جدید ہے۔ حالی سے پہلے تنقید ''اقلیدس کا فرضی نقطہ'' یا ''معشوق کی موہوم کمر'' تھی۔ حالی نے ایک نئے تنقیدی شعور کو جنم دیا۔

اختر انصاری نے اس نئے تنقیدی شعور کو ایک نئے انداز سے پیش کیا ہے۔ یہ نیا تنقیدی انداز، کسی تخلیقی فن کار ہی کے بس کی بات ہے۔ وسعت نظر، ادبی روایات سے ذاتی و شخصی آگاہی اور مشرق و مغرب کے ادبیات عالیہ کا مطالعہ ... '' اختر انصاری کی ادبی شخصیت کے عناصر ثلاثہ ہیں۔

قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے

اردو اکیڈمی سندھ کراچی